اللہ جل جلالہ

خطباتِ فقیر

جلد اٹھارہ



- عظمتِ الٰہی
- وجوہاتِ محبت
- حفظِ قرآن کا شوق
- اخلاصِ نیت
- حسنِ اخلاق کی اہمیت
- طلباء سے قیمتی باتیں
- جذب وسلوک کی تجلیات
- دعا مانگنے کا ادب

پیرِ طریقت، رہبرِ شریعت، مفکرِ اسلام

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

مکتبۃ الفقیر

223 سنت پورہ، فیصل آباد

+92-041-2618003

خُطباتِ فقیر
جلد ۱۸

از افادات

محبوب العلماء والصلحاء

حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

مُجدّدی مدظلہم

مرتب

مولانا محمد حنیف نقشبندی

ناشر

مکتبۃُ الفقیر

223 سنت پورہ فیصل آباد

041-2618003

نام کتاب ———— خطباتِ فقیر (جلد ۱۸)

ازافادات ———— حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مدظلہ

مرتب ———— مولانا محمد حنیف نقشبندی

ناشر ———— مکتبۃ الفقیر
223 سنت پورہ فیصل آباد

اشاعت اوّل ———— ستمبر 2009ء

اشاعت دوم ———— نومبر 2009ء

اشاعت سوم ———— مئی 2010ء

تعداد ———— 1100

کمپیوٹر کمپوزنگ ———— ڈاکٹر شاہد محمود عفی عنہ

بسم الله الرحمن الرحیم

فہرست

عرضِ ناشر

محبوب العلماء والصلحاء حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم کے علوم ومعارف پر مبنی بیانات کو شائع کرنے کا یہ سلسلہ خطباتِ فقیر کے عنوان سے 1996ء بمطابق ۱۴۱۷ھ میں شروع کیا تھا اور اب یہ اٹھارہویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جس طرح شاہین کی پرواز ہر آن بلند سے بلندتر اور فزوں سے فزوں تر ہوتی چلی جاتی ہے کچھ یہی حال حضرت دامت برکاتہم کے بیاناتِ حکمت ومعرفت کا ہے۔ ان کے جس بیان کو بھی سنتے ہیں ایک نئی پروازِ فکر آئینہ دار ہوتا ہے۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ خطابت یا یاد کی ہوئی تقریریں نہیں ہیں بلکہ حضرت کے دل کا سوز اور روح کا گداز ہے جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل کر آپ تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ بقولِ شاعر

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ خانہ

چونکہ یہ صاحبِ دل کی بات ہوتی ہے اس لیے دلوں میں اثر کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت کے بیانات کو ایک قبولیتِ عامہ حاصل ہے۔ حضرت کے بیانات سے علما بھی مستفید ہوتے ہیں عوام بھی مستفید ہوتے ہیں۔ بڑے بھی رہنمائی حاصل کرتے ہیں، چھوٹے بھی سبق حاصل کرتے ہیں۔ مردوں کے دل کی دنیا

بھی بدلتی ہے، خواتین کی بھی اصلاح ہوتی ہے۔ غرض کہ ہر طبقہ کے انسان کے لیے یہ خطبات مشعلِ راہ ہیں۔

''خطباتِ فقیر'' کی اشاعت کا یہ کام ہم نے اسی نیت سے شروع کیا کہ حضرتِ اقدس دامت برکاتہم کی فکر سے سب کو فکر مند کیا جائے اور انہوں نے اپنے مشائخ سے علم و حکمت کے جو موتی اکٹھے کر کے ہم تک پہنچائے ہیں، انہیں موتیوں کی مالا بنا کر عوام تک پہنچایا جائے۔ یہ ہمارے ادارے کا ایک مشن ہے جو ان شاء اللہ سلسلہ وار جاری رہے گا۔ قارئینِ کرام کی خدمت میں بھی گزارش ہے کہ اس مجموعہ، خطبات کو ایک عام کتاب سمجھ کر نہ پڑھا جائے کیونکہ یہ بحرِ معرفت کے ایسے موتیوں کی مالا ہے جن کی قدر و قیمت اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ صاحبِ خطبات کی بے مثال فصاحت و بلاغت، ذہانت و فطانت اور حلاوت و ذکاوت کا فقید المثال اظہار ہے جس سے اہلِ ذوق حضرات کو محظوظ ہونے کا بہترین موقع ملتا ہے۔

قارئین کرام سے گزارش ہے کہ اشاعت کے اس کام میں کہیں کوئی کمی یا کوتاہی محسوس ہو یا اس کی بہتری کے لیے تجاویز رکھتے ہوں تو مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں تا زیست اپنی رضا کیلئے یہ خدمت سر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائیں اور اسے آخرت کے لئے صدقہ، جاریہ بنائیں۔ آمین بحرمت سید المرسلین ﷺ

ڈاکٹر شاہد محمود نقشبندی عفی عنہ

خادم مکتبۃ الفقیر فیصل آباد

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِهِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ!

فقیر کو جب عاجز کے شیخ مرشد عالم حضرت مولانا پیر غلام حبیب نقشبندی مجددی نور اللہ مرقدہ نے اشاعت سلسلہ کے کام کی ذمہ داری سونپی تو ابتدا میں چند دن اپنی بے بضاعتی کے احساس کے تحت اس کام کے کرنے میں متذبذب رہا، لیکن حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ نے بھانپ لیا، چنانچہ فرمایا کہ بھئی تم نے اپنی طرف سے اس کام کو نہیں کرنا بلکہ اپنے بڑوں کا حکم پورا کرنا ہے، کیوں نہیں کرتے؟ مزید فرمایا کہ جب بھی مجلس میں بیان کے لیے بیٹھو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جایا کرو، بڑوں کی نسبت تمہاری پشت پناہی کرے گی۔ چنانچہ حضرت کے حکم اور نصیحت کو پیش نظر رکھتے ہوئے بندہ نے وعظ و نصیحت اور بیانات کا سلسلہ شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوئی، حلقہ بڑھتا رہا اور الحمد للہ شرکاء کو کافی فائدہ بھی ہوتا کیونکہ ان کی زندگیوں میں تبدیلی عاجز خود بھی دیکھتا تھا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد چہار اطراف سے بیانات کے لیے دعوتیں آنے شروع ہو گئیں۔ شیخ کا حکم تھا، سرتابی کی مجال کہاں؟ جب بھی دعوت ملی رختِ سفر باندھا اور عازمِ سفر ہوئے۔ اس کثرت سے اسفار ہوئے کہ بعض اوقات صبح ایک ملک، دوپہر دوسرے ملک اور رات تیسرے ملک میں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ملکوں کو محلّہ بنا دیا۔ اِس ناتواں میں یہ ہمت کہاں؟...... مگر وہ جس سے چاہیں کام لے لیتے ہیں۔ بقول شخصے

”قدم اٹھتے نہیں اٹھوائے جاتے ہیں“

حقیقت یہ ہے کہ یہ میرے شیخ کی دعا ہے اور اکابر کا فیض ہے جو کام کر رہا ہے، و اما بنعمة ربك فحدث ۔

بیانات کی افادیت کو دیکھتے ہوئے کچھ عرصے بعد جماعت کے کچھ دوستوں نے ان کو کتابی شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ شروع کیا، مکتبۃ الفقیر نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری اٹھائی، یوں خطبات فقیر کے عنوان سے نمبروار یہ ایک سلسلہ چل پڑا۔ یہ عاجز کئی ایسی جگہوں پر بھی گیا جہاں یہ خطبات پہلے پہنچے ہوئے تھے اور وہاں علما طلبا نے کافی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

ان خطبات کے مطالعے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رکھیں کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ بیانات کا مجموعہ ہے، ان میں علمی غلطی یا بھول کا امکان موجود ہوتا ہے۔ اس لیے معزز علمائے کرام سے گزارش ہے کہ جہاں کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو اصلاح فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔ دعا ہے کہ جو حضرات بھی ان بیانات کی ترتیب و اشاعت میں کوشاں ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کی کوششوں کو شرف قبولیت عطا فرمائیں اور انہیں اپنی رضا اپنی لقا اور اپنا مشاہدہ نصیب فرمائیں اور عاجز کو بھی مرتے دم تک اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمائیں۔ آمین ثم آمین

دعا گو و دعا جو

فقیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی

كان الله له عوضا عن كل شيء

﴿يَا اَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ (الفاطر:۱۵)

عظمتِ الٰہی

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

بمقام: جامع مسجد مدینہ، جھنگ صدر

بتاریخ: ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۱ء برموقع: سالانہ اجتماع ۲۰۰۱ء

اقتباس

تصوف کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اپنی بڑائی نکل جائے اور اللہ کی عظمت دل میں آجائے۔ جس نے اس کو سمجھ لیا اس نے سارا تصوف سمجھ لیا۔ پھر وہ

......میں کی بات نہیں کر سکتا

......کوئی اونچا بول نہیں بول سکتا

......وہ اللہ کا عاجز اور مسکین بندہ بن کر رہے گا۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا: ؎

یہ دل کی ہے آواز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
اس پر ہے مجھ کو ناز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

جائے۔ اگر اس کی شان ذہن کے اندر جم جائے تو پھر انسان اس کی معصیت کے تصور سے بھی گھبراتا ہے۔ یہ سوچتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ میں اللہ رب العزت کا حکم توڑ رہا ہوں۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ

(الفاطر:۱۵)

''اے انسانو! تم سب کے سب اللہ کے محتاج ہو اور اللہ رب العزت غنی اور حمید ہے''

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ وَ یَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ (الفاطر:۱۶)

''اگر وہ چاہے تو تمہیں لے جائے اور تمہاری جگہ نئی مخلوق کو پیدا کر دے۔''

وَ مَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ (الفاطر:۱۷)

''اور یہ کام اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔''

اس آیت میں اللہ رب العزت کی عظمت سامنے آتی ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اس آیت کی روشنی میں اپنی اوقات پہچانیں اور اللہ رب العزت کی شان کو پہچانیں۔ جب اللہ رب العزت کی شان اور عظمت دلوں میں بیٹھ جائے تو پھر انسان حکم الٰہی کو عظیم سمجھے گا اور اس کو توڑتے ہوئے دل گھبرائے گا اور انسان سوچے گا کہ میں کتنے عظیم پروردگار کی نافرمانی کر رہا ہوں۔ پھر اسے اللہ رب العزت کی عبادت میں بھی مزہ آئے گا۔

میرے لیے یہی فخر کافی ہے:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''اے اللہ! میرے لیے یہی عزت کافی ہے کہ تو میرا پروردگار ہے اور میرے لیے یہی فخر کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔''

اس لیے کہ ان کے دل میں اللہ رب العزت کی عظمت اتر چکی تھی۔ چنانچہ ان کو بندگی میں مزا آتا تھا۔

عبادت کس کا حق ہے؟

یاد رکھیں! عبادت اللہ کا حق ہے۔ کسی حال میں بھی غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں۔ یہ حق مخصوص ہے اللہ کے ساتھ۔ سچی بات یہی ہے کہ انسان

......اللہ رب العزت کی عظمت کو مانے

......اس کے سامنے تذلل کو قبول کرے

......جسم کی سب سے معزز جگہ، پیشانی کو اس کے سامنے زمین پر ٹکائے

......اس کے سامنے سجدے میں اپنی ناک رگڑے

جب یہ اللہ کے سامنے اس طرح بچھ جاتا ہے، تب اللہ رب العزت اسے اپنا قرب عطا فرما دیتے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں فرمایا:

﴿ وَاسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ ﴾ (العلق:۱۹)

یہاں سجدے کے بعد قرب کا تذکرہ ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب انسان سجدے کی حالت میں اس طرح اپنے آپ کو پامال کرے گا اور مٹائے گا، تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنا قرب بھی عطا فرمائے گا۔

فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ پر گھاس ہو تو آدمی کو چاہیے کہ سجدے میں جاتے ہوئے اپنے سر کو دبائے کہ نیچے سے زمین کی سختی محسوس ہونے لگ جائے۔ اگر وہ گھاس کے اوپر اوپر سجدہ کرے گا تو سجدہ نہیں ہوگا۔ ایسی جگہ پر سر کو نیچے دبانا لازم ہے۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ اس بندے نے اپنے آپ کو اتنا جھکایا جتنا یہ جھکا سکتا

تھا، اب اس سجدے کی وجہ سے پروردگار نے اس کو اتنا اٹھایا جتنا وہ اٹھ سکتا تھا۔ اس لیے فرمایا:

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِ

''نماز مومن کی معراج ہے۔''

ہم اللہ رب العزت کے سامنے جھکنا سیکھیں اور اس کی عظمت دل میں پیدا کریں۔

محبت کی معراج:

جب ہم کلمہ پڑھتے ہیں۔...... لَآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰـہُ......تو اس میں ہم اقرار کرتے ہیں کہ ''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے''۔ ہم اللہ کے سامنے یہ کتنی بڑی بات کہہ دیتے ہیں، لیکن سمجھ ہی نہیں ہوتی۔ اس بات کو ذرا تفصیل سے سن لیجیے۔

- ......جب کسی کے ساتھ تعلق کی ابتدا ہوتی ہے تو اس کی ابتدائی کیفیت کو ''رغبت'' کہتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ طبیعت میں فلاں چیز کی رغبت پیدا ہوئی۔
- ......پھر جب یہ رغبت بڑھ جاتی ہے تو اسے ''طلب'' کہتے ہیں۔ جیسے کہتے ہیں کہ اس بندے کے دل میں فلاں چیز کی طلب پیدا ہوئی۔
- ......پھر جب طلب بہت بڑھ جاتی ہے تو اس کو ''محبت'' کہتے ہیں۔ کہتے ہیں نا، جی اس کے دل میں فلاں چیز کی محبت پیدا ہوگئی ہے۔
- ......پھر جب یہ محبت بڑھ جاتی ہے اور شدید ہو جاتی ہے تو اس کو ''عبادت'' کہتے ہیں۔

اس عاجز نے چند نوجوانوں سے پوچھا: بتاؤ! انسان اپنے محبوب کو سب سے زیادہ قیمتی چیز کیا پیش کر سکتا ہے؟ یعنی محبت کی معراج کیا ہے؟

ایک نے کہا: اپنا سب مال لٹا دے

دوسرے نے کہا: اپنے آپ کو اس کے لیے فارغ کر لے

تیسرے نے کہا: اپنی جان بھی قربان کر دے

وہ جوانوں والے ہی جواب دیتے رہے۔ چنانچہ میں نے کہا: بھئی! کوئی بوڑھوں والا جواب بھی دو۔ کہنے لگے: جی! وہ تو پھر آپ ہی دے سکتے ہیں۔ چنانچہ پھر میں نے ان کو بات سمجھائی:

''دیکھیے! محبت کی معراج یہ ہے کہ محبوب کی محبت دل میں اتنی سما جائے، اتنی سما جائے کہ محبّ اس محبت میں بے قرار ہو کر اپنی پیشانی محبوب کے قدموں پر رکھ دے۔''

یعنی وہ اپنے محبوب کو اپنا معبود بنا لے، یہی محبت کی معراج ہے۔

جب ہم نے کہا:...... لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه...... تو ہم نے گویا اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا: اے اللہ! ہمارے دل میں محبتوں کی جو معراج ہوگی، جو سب سے اعلیٰ تعلق ہو گا، اللہ! وہ فقط تیری ذات کے لیے ہوگا۔ ہم نے اپنی محبتوں اور چاہتوں کو فقط تیری ذات کے لیے مخصوص کر لیا۔ ہم کلمہ پڑھتے وقت یہ عہد کر رہے ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایمان والے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ یوں کہتے ہیں:

﴿ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴾ (التوبۃ:۵۹)

''ہم تو اللہ ہی کی طرف رغبت کرتے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ اگر رغبت ہو دل میں تو اللہ کی ہو۔

پھر آگے طلب ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ جو مجھے چھوڑ کر غیر کو چاہتے ہیں وہ

﴿ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴾ (الحج:۷۳)

''طلب کرنے والا بھی اور جس کو طلب کیا جا رہا ہوتا ہے، وہ دونوں بودے اور ضعیف ہیں۔''

یعنی طلب ہو تو کس کی؟ اللہ کی۔

محبت کا نام آیا تو فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ (البقرة:۱۶۵)

''اور ایمان والوں کو اللہ سے شدید محبت ہوتی ہے۔''

پھر عبادت کے بارے میں فرمایا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔''

اب سوچنا چاہیے کہ جو پروردگار تعلق کی سب سے کمزور قسم ''رغبت'' کو غیر کے لیے پسند نہیں کرتا، وہ تعلق کی سب سے اعلیٰ قسم ''عبادت'' کو غیر کے لیے کیسے پسند فرما لے گا؟

اِلٰہ کسے کہتے ہیں؟

اِلٰــہ کہتے ہیں اس ذات کو جس کے بغیر کسی کا کام نہ چلے اور جس کا کام کسی کے بغیر نہ اٹکے۔ یہ شان فقط اللہ رب العزت کی ہے۔ اس کا کوئی کام کسی کی وجہ سے اٹکتا نہیں اور مخلوق کا کام اس کے بغیر چلتا نہیں۔ حتیٰ کہ دنیا میں کوئی پتہ بھی اس کے اذن اور حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ انبیائے کرام بھی بلند شان والے ہیں، مگر اس کے عاجز بندے ہیں۔

منشائے خداوندی کی تکمیل:

یاد رکھیں! چاہت اور مرضی ہر حال میں اللہ رب العزت کی پوری ہوتی ہے۔

''طلب کرنے والا بھی اور جس کو طلب کیا جا رہا ہوتا ہے، وہ دونوں بودے اور ضعیف ہیں۔''

یعنی طلب ہو تو کس کی؟ اللہ کی۔

محبت کا نام آیا تو فرمایا:

﴿ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور ایمان والوں کو اللہ سے شدید محبت ہوتی ہے۔''

پھر عبادت کے بارے میں فرمایا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

''نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے۔''

اب سوچنا چاہیے کہ جو پروردگار تعلق کی سب سے کمزور قسم ''رغبت'' کو غیر کے لیے پسند نہیں کرتا، وہ تعلق کی سب سے اعلیٰ قسم ''عبادت'' کو غیر کے لیے کیسے پسند فرما لے گا؟

اِلٰہ کسے کہتے ہیں؟

اِلٰـــہ کہتے ہیں اس ذات کو جس کے بغیر کسی کا کام نہ چلے اور جس کا کام کسی کے بغیر نہ اٹکے۔ یہ شان فقط اللہ رب العزت کی ہے۔ اس کا کوئی کام کسی کی وجہ سے اٹکتا نہیں اور مخلوق کا کام اس کے بغیر چلتا نہیں۔ حتیٰ کہ دنیا میں کوئی پتہ بھی اس کے اذن اور حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا۔ انبیائے کرام بھی بلند شان والے ہیں، مگر اس کے عاجز بندے ہیں۔

منشائے خداوندی کی تکمیل:

یاد رکھیں! چاہت اور مرضی ہر حال میں اللہ رب العزت کی پوری ہوتی ہے۔

ذرا غور کیجیے!

⊙ ......سیدنا آدم علیہ السلام جنت میں ہیں۔ چاہتے ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہوں۔ لیکن اللہ رب العزت ان کو دنیا میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام کو بالآخر دنیا میں اتار دیا گیا۔ تو مرضی کس کی پوری ہوئی؟ اللہ رب العزت کی۔

⊙ ......سیدنا نوح علیہ السلام کے سامنے ان کا بیٹا ہے۔ ان کی چاہت ہے کہ بیٹا بچ جائے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں:

﴿ یٰبُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا ﴾ (ھود: ۴۲)

''اے بیٹا! ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا۔''

لیکن اللہ رب العزت کی مرضی نہیں تھی۔ چنانچہ آنکھوں کے سامنے بیٹا ڈوب گیا۔ تو چاہت کس کی پوری ہوئی؟ اللہ رب العزت کی۔

⊙ ......سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو لٹایا ہوا ہے۔ چاہتے ہیں کہ ان کو ذبح کر دیں۔ چھری بھی تیز کر لی، زور سے چلاتے بھی ہیں، مگر اللہ رب العزت نہیں چاہتے۔ چنانچہ ان کی بجائے ایک دنبہ ذبح ہوتا ہے۔ تو مرضی کس کی پوری ہوئی؟ اللہ کی۔

⊙ ......سید الاولین والآخرین نبی علیہ السلام ایک مرتبہ ارادہ فرماتے ہیں کہ میں آج کے بعد شہد کا استعمال نہیں کروں گا، کیونکہ زوجہ محترمہ نے بتا دیا تھا کہ مہک محسوس ہوتی ہے۔ تو محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی چاہت ہے کہ میں شہد کو استعمال نہیں کروں گا۔ لیکن پروردگارِ عالم کی طرف سے فرمان آ گیا:

﴿ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِکَ وَ اللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴾ (تحریم:۱)

تو مرضی کس کی پوری ہوئی؟ اللہ کی۔

معلوم ہوا کہ یہ شان فقط اللہ رب العزت کی ہے کہ ہر حال میں مرضی اسی کی پوری ہوتی ہے۔ محترم جماعت! جب ہر حال میں مرضی اس کی پوری ہونی ہے تو کیوں نہ ہم اپنی مرضی کو اس کی مرضی میں گم کر دیں اور اس کی مرضی پر خوش ہو جائیں۔

بندگی، ایک غلام سے سیکھی:

ایک بزرگ فرماتے تھے کہ مجھے تو بندگی ایک غلام نے سکھائی۔ کسی نے پوچھا: حضرت! وہ کیسے؟ کہنے لگا کہ جب میں اس غلام کو خرید کر لایا تو میں نے اس سے چند باتیں پوچھیں:۔

میں نے پوچھا: تمہارا کیا نام ہے؟

کہنے لگا: جی! جو آپ پکاریں، وہی میرا نام

میں نے پوچھا: تم یہاں کیا کام کر سکتے ہو؟

کہنے لگا: جی! جو آپ ذمے لگائیں، وہی میرا کام

میں نے پوچھا: تم کیسے کپڑے پہنو گے؟

کہنے لگا: جی! جو آپ پہنائیں گے وہی میرا لباس۔

فرماتے ہیں کہ اس غلام نے مجھے اللہ رب العزت کی بندگی سکھا دی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ یہ میرا غلام ہے اور ہر حال میں میری مرضی پہ راضی ہے، تو مجھے ہر حال میں اپنے پروردگار کی مرضی پہ کیوں راضی نہیں ہونا چاہیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو اللہ کی مرضی پہ راضی ہو گیا اس کی زندگی سکھی ہو گئی۔

ایک اشکال کا حیران کن جواب:

ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ وہ ایک مرتبہ اپنے دوستوں کو فرمانے لگے:

''تم کیا سمجھتے ہو اس شخص کے بارے میں جس کی مرضی سے دنیا کا کاروبار چل رہا ہے؟''

جب انہوں نے یہ بات کی تو لوگ بڑے حیران ہوئے کہ یہ تو بڑے محتاط بزرگ تھے، ایسا کلام کبھی نہیں کرتے تھے، آج انہوں نے کیسی بات کر دی۔ چنانچہ انہوں نے کہا: حضرت! آپ کے اس کلام میں کچھ گہرائی نظر آتی ہے، مہربانی فرما کر سمجھا دیجیے۔ چنانچہ پھر حضرت نے فرمایا:

''دیکھو! ہر کام اللہ کی مرضی سے چلتا ہے، میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں گم کر دیا ہے، اب گویا ہر کام میری مرضی سے چل رہا ہے۔''

مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ:

آج تو لوگ کہتے کہ ہم تو وہ کریں گے جو ہماری مرضی ہوگی۔ بھئی! جب کلمہ پڑھ لیا تو ہماری مرضی گئی۔ کلمہ پڑھنے سے پہلے اپنی مرضی تھی اور جب کلمہ پڑھ لیا تو اپنی مرضی کی بجائے مولا کی مرضی آگئی۔

مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

اب اللہ کی مرضی ہر چیز سے زیادہ بلند ہوگئی۔ اب ہمیں اس چیز کو دیکھنا ہے کہ ہم اللہ رب العزت کو کیسے راضی کر سکتے ہیں؟

عبادتِ خداوندی کا پیغام:

عبادتِ خداوندی کا پیغام سب انبیائے کرام نے آکر دیا اور فرمایا:

''لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔''

چنانچہ قرآنِ پاک میں ہے:

﴿ وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ (هود:۵۰)

ایک جگہ پر فرمایا:

﴿ وَ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ﴾ (هود:٦١)

اور ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿ يٰاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمْ ﴾ (البقرۃ:۲۱)

''اے انسانو! عبادت کرو اپنے پروردگار کی''

پروردگارِ عالم کے شاہانہ کلام کی چند جھلکیاں:

⊙......ایک جگہ فرمایا:

وَ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا وَّجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا...... (الفرقان:۵۴)

اللہ اکبر! کیا ہی شان وشوکت ہے کلام کی!

پڑھتے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شہنشاہ خطاب کر رہا ہے۔

⊙......اللہ رب العزت نے انبیائے کرام کو دنیا میں بھیجا۔ ان میں سے جو رسول بن کر تشریف لائے وہ اپنے سے پہلی شریعتوں کو منسوخ کرنے کا اختیار لے کر آئے۔ وہ اللہ رب العزت کی اتنی مقرب اور مقبول ہستیاں تھیں۔ وہ اتنی شان والے تھے کہ اللہ رب العزت نے ان کو خود چنا۔ چنانچہ اللہ رب العزت نے فرمایا:

﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ﴾ (الانعام:۱۲۴)

ان کو خود اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا اور بڑے زوردار الفاظ میں قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (انعام: ۸۷)

ایسے زوردار الفاظ میں پیغام دیا کہ ہم نے رسولوں کو چنا اور جب بھیجا تو ان کو

رہنما بنا کر بھیجا۔

⊙......اللہ رب العزت نے نبی علیہ السلام پر قرآن نازل فرمایا۔اس قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خو لے لیا۔جس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا تذکرہ فرمایاوہ آیت بھی عجیب ہے۔فرماتے ہیں:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ﴾ (الحجر:۹)

اب ذرااس کے ترجمے پرغورکریں۔فرمایا:

اِنَّا ’’ہم نے‘‘

نَحنُ ’’ہم نے‘‘

نَزَّلنَا ’’ہم نے......‘‘

وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْن ’’اورہم نے......‘‘

یہ عجیب سی بات ہے کہ ایک ہی فقرے میں چار مرتبہ ’’ہم نے،ہم نے‘‘ فرمایا۔

یا اللہ! یہ کیا اعجاز ہے کلام کا!

کیا گہرائی ہے اس کلام میں!

شہنشاہِ حقیقی کا شاہانہ انداز دیکھیے کہ قرآن پاک کی حفاظت کا تذکرہ کرنا تھا۔اتنی ٹھوس بات کی کہ اس سے زیادہ ٹھوس بات کا انسان تصور ہی نہیں کرسکتا ہے۔

﴿اِنَّانَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّالَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾

مفسرین نے یہاں چار مرتبہ ’’ہم نے،ہم نے‘‘ کا مطلب لکھا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ یہ جو بار بار ’’ہم نے،ہم نے‘‘ کا تذکرہ کیا،اس میں کلام کے اندر ایک عظمت پیدا کرنا مقصود تھا۔یہ بتانا مقصود تھا کہ جان لو کہ یہ کلام کرنے والی ذات کتنی بلند ذات ہے۔چنانچہ قدرے وضاحت کے ساتھ اردو میں اس کا ترجمہ یہ بنے گا:

’’ہم نے،ہاں!ہم نے، ہاں ہاں!ہم نے ہی قرآن کو نازل کیا اور اس کی

حفاظت کے ذمہ دار بھی ہم ہیں۔''

اب دیکھیے کہ بات کے اندر کتنی قوت آ گئی۔اس آیت سے اللہ رب العزت کی کتنی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔اصل میں یہ بتانا مقصود ہے کہ لوگو!

......ہماری عظمت

......قوت

......طاقت

......بساطت

......شان وشوکت

کو دیکھو کہ ہم کتنی عظیم ذات ہیں۔ہم اس ذات کے بندے ہیں۔وہ دینے والا ہے ہم لینے والے ہیں،وہ ہمارا پروردگار ہے......اللہ اکبر کبیرا......جب انسان اللہ رب العزت کی عظمت کا تصور کرتا ہے تو دل میں عجیب ٹھنڈ پیدا ہو جاتی ہے۔

انبیائے کرام کی عاجزی:

سب کے سب انبیائے کرام اس کے عاجز بندے تھے۔سب نے اس کے سامنے

......عاجزی کی

......فریاد کی

......گڑگڑائے

......سجدہ ریز رہے

......رو رو کر اس کو مناتے رہے

......اسی کے سامنے دامن پھیلاتے ہیں۔

آیات قرآنی میں عاجزی کا درس:

سید الاولین والآخرین سیدنا رسول اللہ ﷺ کے بارے میں قرآن مجید کی جو آیتیں ہیں یا احادیث ہیں، ان پر ذرا غور کریں تو ان سے اللہ رب العزت کی عظمت کا عجیب سبق ملتا ہے۔ چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کر دیتے ہیں:

⊙...... نبی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

مَا اَدْرِیْ مَا یَفْعَلُ بِیْ وَ لَا بِکُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ

''میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا، تمہارے ساتھ کیا ہوگا، میں تو وہی کرتا ہوں جو میرے پرودگار کی طرف سے مجھے وحی آتی ہے۔''

اس آیت پر ذرا غور کیجیے کہ کتنی عاجزی ظاہر ہوتی ہے اور اللہ رب العزت کی کتنی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔

﴿وَ رَبُّکَ یَخْلُقُ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَ یَخْتَارُ مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃَ﴾

(القصص:۶۸)

⊙......ایک جگہ پر فرمایا:

مَایَکُوْنُ لِیْ اَنْ اُبَدِّلَہٗ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰی اِلَیَّ

⊙...... پروردگار عالم اپنے محبوب ﷺ سے ایک جگہ عجیب خطاب فرماتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَکَ ﴾(ھود:۱۱۲)

ہمارے حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کا مفہوم یوں بیان فرمایا کرتے تھے: فاستَقِم کَمَا اُمِرتَ ''اے محبوب! جو آپ کو حکم دیا گیا آپ اس پر تکلے کی طرح سیدھے رہیے۔''

⊙......اللہ تعالیٰ اپنے محبوب ﷺ کو فرماتے ہیں:

﴿لَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ﴾ (الاسراء:۸۶)

''اگر ہم چاہیں ہم سب کچھ جو آپ پر نازل کیا اسے واپس لے جائیں۔''

ثقیلہ کا صیغہ...... ایسی بات کی کہ اس سے زیادہ تاکید کی اور کوئی بات کی ہی نہیں جا سکتی۔ ذرا قرآن پاک کا اسلوب دیکھیے! کیا ہی جلالتِ شان ہے اس کلام میں!

حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب محبوب ﷺ کو یہ کلام فرمایا جا رہا ہے تو اس آیت کو پڑھنے کے بعد کوئی آدمی بھی اپنے علم پر ناز نہیں کر سکتا۔ جب محبوب ﷺ کو یہ خطاب ہے تو ہم کس کھیت کی گاجر مولی ہیں!؟

⊙...... عمل کے بارے میں بھی ایک آیت ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے محبوب!

لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْهِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَ ضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا

(ھود:۷۴)

...... اللہ اکبر!

اب اس آیت کا ترجمہ تو آپ گھروں میں جا کر دیکھیے۔ اس عاجز کے اندر تو ہمت نہیں کہ اس آیت کا ترجمہ کر کے سنا دے۔

جب اللہ تعالیٰ محبوب ﷺ کو فرماتے ہیں ''اگر ہم آپ کو ثابت قدمی نہ دیتے'' تو پھر اگر ہم میں سے کوئی عمل کر رہا ہے تو یہ ہمارا کمال نہیں، یہ پروردگار کا کمال ہے۔ یہ اس مالک کا کمال ہے۔ یہ اس مالک کی توفیق ہے کہ اس نے توفیق دی ہوئی ہے۔ ورنہ ہم کس کھاتے میں ہیں۔

مسنون دعاؤں میں عاجزی کا درس:

نبی علیہ السلام نے جو دعائیں مانگیں ان دعاؤں کو اگر زبانی یاد کیا جائے اور

معانی کے استحضار کے ساتھ ان کو مانگا جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرماتے ہیں۔آج کل لوگ دعائیں مانگتے نہیں بلکہ دعائیں پڑھتے ہیں۔یعنی ایسا زمانہ آگیا ہے کہ دعائیں پڑھنے کا رواج ہے...... رَبَّنَا ظَلَمْنَا...... رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا...... فقط پڑھ رہے ہوتے ہیں، مانگ نہیں رہے ہوتے۔

دعا پڑھنے میں اور دعا مانگنے میں فرق ہوتا ہے۔ایک ہوتا ہے زبان کا مانگنا اور ایک ہوتا ہے دل کا مانگنا۔لوگ کہتے ہیں کہ خدا ہماری سنتا نہیں،اور ہم کہتے ہیں کہ خدا تو سب کی سنتا ہے لوگوں کے دل گونگے ہوتے ہیں جو بولتے ہی نہیں ہیں۔وہ زبان سے نکلی ہوئی نہیں قبول کرتا بلکہ دل سے نکلی ہوئی قبول کرتا ہے۔بات ہر ایک کی سنتا ہے لیکن قبول اس کی کرتا ہے جس کی دل سے نکل رہی ہوتی ہے۔

⊙...... چنانچہ نبی علیہ السلام نے عجز بھری بہت سی دعائیں مانگیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اللہ کے محبوب ﷺ نے ایک عجیب دعا مانگی۔فرمایا:

اَنَا بَاءِسُ الْفَقِیْرِ اَلْمُسْتَغِیْثُ الْمُسْتَجِیْبُ الْوَجِلُ الْمُشْفِقُ الْمُقِرُّ الْمُعْتَرِفُ بِذَنْبِیْ اَسْئَلُکَ مَسْئَلَۃَ الْمِسْکِیْنِ وَ اَبْتَہِلُ اِلَیْکَ اِبْتِہَالَ الْمُذْنِبِ الذَّلِیْلِ

”میں ہوں مصیبت زدہ محتاج،فریاد کرنے والا، پناہ ڈھونڈنے والا،ترساں ولرزاں،اقرار کرنے والا،اپنے قصور کا اعتراف کرنے والا،اے اللہ! میں مسکینوں کی طرح آپ سے سوال کرتا ہوں۔میں کسی ذلیل گناہ گار کی طرح آپ کے در پر گڑگڑاتا ہوں۔“

اللہ رب العزت کے محبوب،اتنی شان ان کی،سید الاولین والآخرین ہیں،مگر دعا میں دیکھیے کتنی عاجزی فرما رہے ہیں۔ذرا اپنے دل سے پوچھیے کہ یہ الفاظ اپنی زبان سے ہم نے کبھی اپنے لیے استعمال کیے ہیں۔ہم اپنے لیے یہ الفاظ استعمال نہیں

کر سکتے۔ پھر دعائیں کیسے قبول ہوں گی؟

پروردگار کے سامنے تو جھکنا ہے، عاجزی کا اظہار کرنا ہے۔ اس جھکنے میں ہی ہماری بلندی ہے۔ اس جھکنے میں ہی ہمارا بڑا پن ہے۔ جو بڑا بننا چاہے وہ جھک جائے، اللہ اس کو بڑا بنا دیں گے۔ دیکھیں! کتنا آسان نسخہ ہے۔

⊙...... بدر کے دن نبی علیہ السلام سجدے میں اللہ رب العزت کے حضور دعائیں مانگ رہے ہیں۔ اور دعا بھی کیا مانگی؟ اتنا روئے اتنا روئے اور دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اَنْ تُهْلِكَ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ لَا تُعْبَدُ اَبَدًا

”اے اللہ! اگر آپ اس چھوٹی سی جماعت کو (جو گروہ ہے مسلمانوں کا) آج کے دن ہلاک کریں گے تو اس کے بعد دنیا میں کوئی آپ کی عبادت کرنے والا نہیں بچے گا۔“

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ چند لوگ جو تین سو تیرہ تھے وہ ختم ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو پیدا کر دیتے۔ تو یہ کیوں کہا کہ اس کے بعد قیامت تک تیری کوئی عبادت ہی نہیں کرے گا؟

محدثین نے یہاں ایک نکتہ لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب اس جماعت کا نام لیا تو نبی علیہ السلام نے اپنے آپ کو بھی اس میں شامل فرما لیا تھا، اور واقعی اگر آپ ﷺ اس میں شامل ہوتے اور وہ جماعت ختم ہو جاتی تو پھر قیامت تک اللہ کی عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوتا۔

تو محبوب ﷺ کی عاجزی دیکھیے کہ دعا مانگتے ہوئے اپنے آپ کو بھی اپنے خدام کے ساتھ شامل فرماتے تھے...... اللہ اکبر کبیرا......

جب سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو وہ کہنے لگے:

”اے اللہ کے محبوب ﷺ! آپ سجدے سے سر اٹھایئے، یقیناً اللہ رب

العزت آپ کی مدد فرمائیں گے۔''

یعنی اتنی عاجزی کی کہ دیکھنے والوں کا دل نرم ہو گیا۔ ہمارے حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے ''تم اللہ کی اتنی عبادت کرو، اتنی عبادت کرو، کہ خالق اور مخلوق دونوں کو تم پر ترس آنے لگ جائے۔''

⊙...... نبی علیہ السلام نے ایک مرتبہ دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِیْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَائُكَ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ

''اے اللہ میں تیرا ہی بندہ ہوں اور تیرے ہی بندے اور تیری ہی بندی کا بیٹا ہوں۔ میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، تیرا ہر حکم میرے حق میں نافذ ہے، تیرا ہر فیصلہ میرے حق میں عین انصاف ہے۔ میں تجھ پر اس نام کے وسیلے سے جو تیرا ہے، تو نے خود اس کو اپنا نام رکھا یا اس کو اپنی کتاب (قرآن) میں نازل فرمایا، اپنی مخلوق میں سے کسی کو بتایا، یا تو نے اس کو علم غیب کے خزانے میں اپنے ہی پاس محفوظ رکھا ہے۔ (اے اللہ! میں تیرے ہر ہر نام کے طفیل تجھ سے سوال کرتا ہوں)...... اللہ اکبر کبیرا۔

ہم بھی اپنی دعاؤں میں اللہ رب العزت کے سامنے گڑگڑائیں۔ جس طرح ہمیں مانگنا چاہیے اسی طرح ہم عاجزی اور زاری کے ساتھ دعا مانگیں۔

⊙...... جب نبی علیہ السلام طائف کے سفر سے واپس آ رہے تھے تو اس وقت آپ ﷺ کے پاس فرشتے آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے محبوب! آپ اجازت دے دیجیے، ہم بستی والوں کو ختم کر دیں۔ لیکن اللہ کے محبوب ﷺ نے اجازت نہ

دی۔ البتہ ایک عجیب دعا مانگی۔

اَللّٰھُمَّ اِلَیْکَ اَشْکُوْ ضِعْفَ قُوَّتِیْ وَ قِلَّۃَ حِیْلَتِیْ وَ ھَوَانِیْ عَلَی النَّاسِ یَا اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ اَنْتَ رَبُّ الْمُسْتَضْعِفِیْنَ وَ اَنْتَ رَبِّیْ اِلیٰ مَنْ تَکِلُنِیْ اِلیٰ بَعِیْد یتجھمنی اَمْ اِلیٰ عَدُوْ مَلَّکْتَہٗ اَمْرِیْ اِنْ لَمْ یَکُنْ بِکَ عَلَیَّ غَضَبٍ فَلی ابالی

''اے اللہ! میں تجھ سے ہی شکایت کرتا ہوں اپنی طاقت کی کمی کا، اور اپنے حیلے کی قلت کا، اور لوگوں کے سامنے اپنی کمزوری کا، اے سب رحم کرنے والوں میں سے زیادہ رحم کرنے والے! آپ کمزوروں کے پرودگار ہیں، اور آپ میرے بھی رب ہیں، آپ مجھے کس کے حوالے کرتے ہیں، کسی غیر کے سامنے جو مجھ سے ترش رو ہوتا ہے، یا میرے دشمن کے پاس جس کو آپ نے میرے کام کا والی بنا دیا، اے اللہ! اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو مجھے کسی چیز کی پرواہ نہی ہے۔'' ......اللہ اکبر!

کیسی عجیب بات کہی کہ اے اللہ! اگر آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں تو مجھے کسی چیز کی پروانہیں ہے۔

کیا غم ہے جو ہے ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
اللہ کے رستے کی جو موت آئے مسیحا!
اکسیر یہی ایک دوا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

دعا مانگتے ہوئے اللہ کے محبوب ﷺ نے آگے فرمایا:

وَ لٰكِنْ عَافِيَتُكَ هِيَ اَوْسَعُ لِيْ اَعُوْذُ بِنُوْرِ وَجْهِكَ الَّذِي اَشْرَقَتْ لَهُ الظُّلُمٰتُ

''اور لیکن تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسیع ہے۔(اب ذرا الفاظ پر غور کیجیے، دعا مانگ رہے ہیں مگر اللہ رب العزت کے سامنے کیا بات فرماتے ہیں) میں تیری پناہ مانگتا ہوں تیرے چہرے کے اس نور کے طفیل جس سے کہ سب اندھیریاں روشن ہو گئیں۔''

(کیسی عجیب بات کہی ہے! نبی علیہ السلام کے دل میں اللہ رب العزت کی محبت کیسے ٹھاٹھیں مار رہی ہو گی اور اللہ رب العزت کے حسن و جمال کا نبی علیہ السلام کے پاس کیا تصور ہو گا!!)

آگے فرمایا:

وصلح عليه امر الدنيا والاخرة من ان تنزل بی غضبك اويحل علی سخطك لك العتبی حتی ترضی

''اور جس سے دنیا اور آخرت کے سب کام سنور گئے۔اے اللہ! تجھے اس وقت تک منانا ضروری ہے جب تک کہ تو راضی نہ ہو جائے۔''

تو اللہ تعالیٰ سے ہی اپنی کمزوری کی شکایت کی۔حضرت شاہ صاحب فرمار ہے تھے کہ آج ہم بندوں سے شکایت کرتے ہیں اور اللہ والے اللہ سے باتیں کرتے ہیں۔

⊙......کہیں دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِيْنَا وَجَوَارِحَنَا بِيَدِكَ لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا

کیسے عاجزی کے الفاظ ہیں...... واقعی ہم عاجز ہیں۔اختیار پروردگار کا ہے۔ہم سر جھکائیں اور پروردگار کی عبادت کریں اور اس عبادت کو بھی اللہ کا کمال سمجھیں کہ

اس نے توفیق دی۔اپنی طرف منسوب نہ کریں۔ہم جو نمازیں پڑھتے پھرتے ہیں نا، یہ ہمارا کمال نہیں ہے، یہ کمال والے کا کمال ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عنایتِ خاصہ:

آج بندہ جس سے ناراض ہوتا ہے اس سے وہ کہتا ہے کہ تو مجھے اس محلے میں نظر نہ آنا۔اس گلی سے نہ گزرنا۔میں تجھے اپنے گھر کے قریب نہ دیکھوں۔بالکل اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی جب کسی بندے سے ناراض ہوتے ہیں تو اس بندے سے اپنے گھر میں آنے کی توفیق چھین لیا کرتے ہیں۔وہ مسجد کی طرف نہیں آتا۔اور جو مسجد میں آجاتے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ رب العزت ان سے خوش ہیں۔اس لیے کہ ناپسند بدمعاش کو کوئی گھر بلاتا ہے؟ کوئی نہیں بلاتا۔گھر میں اسی کو لے جاتے ہیں جس کے ساتھ محبت کا تعلق ہوتا ہے۔اللہ رب العزت کو بھی جن سے محبت ہوتی ہے، انہی کو وہ اپنے گھر میں آنے کی توفیق دیتے ہیں۔اسی لیے جب حضرت حاجی صاحب سے کسی نے پوچھا: حضرت! ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ ہماری نماز قبول ہوئی یا نہیں؟ تو حضرت نے عجیب جواب دیا۔فرمایا: تیرا ایک نماز کے پڑھنے کے بعد دوسری نماز کے لیے مسجد میں آجانا تیری پہلی نماز کے قبول ہونے کی دلیل ہے۔وہ پہلی نماز قبول ہوئی ہے تبھی تو دوبارہ اس کے دربار میں پہنچ گئے ہو۔قبول نہ ہوتی تو پھر نکال دیے جاتے۔

حدیث میں ہے کہ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

"فَوَ اللّٰہِ لَوْلَا لِلّٰہِ مَا اھْتَدَیْنَا وَ لَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا"

"اللہ کی قسم! اگر اللہ نہ ہوتے تو ہم ہدایت پاسکتے، نہ صدقہ دینے والے ہوتے اور نہ ہی ہم نماز پڑھ پاتے۔"

یعنی ہم جو یہ سب کام کر رہے ہیں یہ کس وجہ سے کر رہے ہیں؟ اللہ کی عنایتِ خاصہ کی وجہ سے کر رہے ہیں۔

نومولود بچے کے کان میں اذان واقامت:

حدیث پاک میں آیا ہے کہ جب حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی گود ہری ہوئی اور نبی علیہ السلام کے فرزند ارجمند سیدنا ابراہیم رضی اللہ عنہ کی پیدائش ہوئی تو خود نبی علیہ السلام نے ان کے کان میں اذان کہی اور دوسرے کان میں اقامت کہی۔

اذان واقامت میں عظمتِ الٰہی کا پیغام:

اذان و اقامت کے الفاظ کہاں سے شروع ہوتے ہیں؟ اللہ اکبر سے۔تو بندے کے دونوں کانوں میں شریعت نے جو پیغام پہنچایا، وہ کون سا تھا؟ اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا پیغام پہنچایا۔ تو اس دنیا میں بچے کے کان میں جو سب سے پہلا پیغام پہنچایا جاتا ہے وہ اللہ رب العزت کی عظمت کا ہے۔ عجیب بات ہے کہ آج ہم اس بات کو بھولے پھرتے ہیں۔

اس پیغام میں ایک دو بار نہیں بلکہ چار مرتبہ اللہ اکبر کہا۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر...... اللہ اکبر، اللہ اکبر

چار مرتبہ کیوں کہا؟

علما نے اس کا جواب لکھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ کائنات چار عناصر سے مل کر بنی ہے۔ آگ، پانی، ہوا اور مٹی۔ ان چاروں عناصر کی اپنی اپنی طاقت اور قوت ہے۔

⊙...... ہوا کے اندر ایک طاقت ہے۔ جب یہ چلتی ہے تو شہروں کا صفایا کر دیا کرتی ہے۔ قومِ عاد جیسی قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا کے رکھ دیتی ہے۔

ایک ملک کے اندر سائیکلون آیا۔ جسے ہوا کا بگولا بھی کہتے ہیں۔ پنجابی میں اس کو ''ولوہنا'' کہتے ہیں۔ جب وہ سائیکلون آیا تو اس نے ایک کار کو ایک جگہ سے اٹھایا اور اس کو اس نے تین سو میل دور جا کر پھینک دیا۔ اصل میں ہوا کا گھیر تین سو میل تھا۔ یعنی

تین سومیل کے دائرے کی شکل میں ہوا گھوم رہی تھی۔

⊙ ...... پانی کے اندر ایک طاقت ہے۔ انسان جن جہازوں کو اس انداز سے بناتا ہے کہ وہ کبھی نہیں ڈوبیں گے، جب طوفان آتا ہے تو وہ TITANIG ٹکڑے ہو کر سمندر کے نیچے اتر جاتا ہے۔

⊙ ...... آگ کے اندر ایک طاقت ہے۔ بعض اوقات جب آگ چلتی ہے تو لوگوں سے بجھتی ہی نہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے سمندر میں آگ دیکھی...... سمندر میں آگ!!! کتنی عجیب بات ہے۔ نیچے پانی کا سمندر، اوپر آگ لگی ہوئی ہے اور بندوں سے بجھتی ہی نہیں۔ اللہ! تیری عظمت کی یہ کیا ہی عجیب نشانی ہے!...... ہم نے عملے سے پوچھا: اس آگ کی وجہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگے: سمندر کی اس جگہ پر تیل کا چشمہ نکل رہا ہے۔ اس چشمے کے اوپر ایک گیس ہے وہ تیزی سے نکل رہی ہے، کبھی کسی وجہ سے (مثلاً بارش ہوئی یا بجلی کڑکی تو) اس کو آگ لگ گئی، اب نیچے سے اس کو فیول مل رہا ہے اور اللہ نے یہ ٹارچ جلا دی ہے، اس کو ہم جتنا بجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ آگ بجھنے کا نام نہیں لیتی۔

⊙ ...... مٹی کی یعنی زمین کی اپنی طاقت ہے۔ زلزلہ آتا ہے تو لوگوں کی عمارتیں زمین کے اوپر سجدہ کرنے لگ جاتی ہیں۔

ان چار طاقت ور عناصر سے مل کر یہ کائنات بنی ہے۔ اذان اور اقامت میں یہ پیغام دیا جارہا ہوتا ہے کہ اے بندے! تمہیں اس ذات کی طرف بلایا جارہا ہے کہ جس کی عظمت اور طاقت

...... ہوا کی طاقت سے بھی زیادہ

...... پانی کی طاقت سے بھی زیادہ

...... آگ کی طاقت سے بھی زیادہ

......مٹی کی طاقت سے بھی زیادہ ہے۔

ان تمام چیزوں کی طاقت سے بڑی طاقت والی جو ذات ہے، اے بندے! تجھے اس ذات کے دربار کی طرف بلایا جا رہا ہے۔

اللہ اکبر، اللہ اکبر......اللہ اکبر، اللہ اکبر

بعض علما نے کہا کہ چار مرتبہ اللہ اکبر اس لیے کہلوایا کہ اے بندے! تو چاروں طرف نگاہ اٹھائے تو تجھے اللہ ہی کی کبریائی نظر آئے کہ سب عظمتیں اس پروردگار کے لیے ہیں۔

تحنیک میں چند علمی نکات:

نبی علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند کا نام ''ابراہیم'' رکھا۔ پھر اذان دی اور اقامت کہنے کے بعد حضور ﷺ نے تحنیک کی۔ یعنی کھجور یا شہد منہ میں ڈال کر اور پھر اپنے دہن مبارک سے نکال کر بچے کو دی۔ یہ سنت ہے۔

یہاں پر چند علمی نکات ہیں:

⊙ ......پہلی بات تو یہ ہے کہ بچے کی پیدائش ماں کے رحم میں ہوتی ہے۔ لیکن بچے کو پیدائش کے بعد غذا ماں کے پستانوں سے ملتی ہے جو سینے پر ہوتے ہیں۔ تو پیدائش رحم میں اور غذا اوپر سینے پر۔ اس طرح بچے کو اللہ نے پیغام دیا: اے میرے بندے! رزق تمہیں کہاں سے ملے گا؟ اوپر سے ملے گا۔ بتانا یہ مقصود تھا کہ تم ساری زندگی کے لیے یہ سبق پکا کر لینا کہ تجھے جب بھی رزق ملنا ہے اوپر سے ملنا ہے۔ بڑے ہو کر بھی اوپر ہی سے ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ ﴾ (الذاریات: ۲۲)

''تمہارا رزق آسمانوں میں ہے''

⊙ ......بچے کا منہ ایک ہے لیکن دودھ پینے کے لیے پستان دو ہیں۔ گویا کہ اللہ

رب العزت نے رزق کا وافر انتظام کیا۔ مقصد کیا تھا؟ تسلی دی کہ ہم نے تیرے لیے ڈبل انتظام کیا ہوا ہے۔ جب کسی کو کہہ دیتے ہیں کہ جی چار بندوں کے لیے ہم نے آٹھ بندوں کا کھانا پکایا ہوا ہے تو بڑی تسلی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پینے کے لیے ایک منہ بنایا اور پینے کے لیے دو چشمے بنائے۔ کہ اے میرے بندے! رزق میں نے ذمے لیا ہے، میں وہ پروردگار ہوں جس نے تمہاری ضرورت سے بھی دوگنا رزق تمہارے لیے تیار کر رکھا ہے، پھر تمہیں کس بات کی پریشانی ہے۔

⊙......اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو منہ ایک دیا اور ہاتھ دو دیے۔ کہ دو ہاتھوں سے کمائے گا اور ایک منہ سے کھائے گا۔ تو پھر کمانا زیادہ یا کھانا زیادہ۔

منصوبہ بندی والوں کو پریشانی ہوتی ہے کہ کریں گے کیا۔ کہتے ہیں کہ جو آئے گا، وہ کھانے کے لیے منہ لے کر آئے گا۔ لیکن کام کرنے کے لیے ان کو دو ہاتھ نظر نہیں آتے۔

⊙...... بچے کے کان میں پہلے اذان دی گئی، اقامت کہی گئی، اس کے بعد بچے کو تحنیک دی گئی۔ یعنی کچھ کھلایا گیا۔ اس میں بھی حکمت تھی کہ اے میرے بندے! حق کا پیغام پہلے سننا، رزق کے لیے ہاتھ پاؤں بعد میں مارنا۔ آج ہم کیا کہتے ہیں؟ کہ دکان سے جب فارغ ہوں گے تو بات سننے آجائیں گے۔ ہم دکان کو اولیت دیتے ہیں اور حق کے پیغام کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ خلافِ فطرت ہے۔ سب سے پہلے کان میں اللہ کی عظمت سنائی گئی اور اس پیغام کو پہنچانے کے بعد اس کو رزق پہنچایا گیا۔ مقصد کیا تھا؟ کہ اے میرے بندے! تو حق کا پیغام پہلے سننا اور رزق کے لیے ہاتھ پاؤں بعد میں مارنا۔

⊙......اللہ تعالیٰ کی عظمت کا یہ پیغام ایک کان میں پہنچایا گیا یا دونوں میں؟ دونوں میں۔ مقصد کیا تھا؟ کہ میرا بندہ! ایسا نہ ہو کہ ایک کان سے ڈال کر دوسرے کان سے

نکال ڈالے۔آج کل ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔اور کئی تو سنتے ہی نہیں ہیں۔ہمارے مرشدِ عالم رحمۃ اللہ علیہ مجمع میں فرماتے تھے:

او سن رہے ہو؟

پھر فرماتے:

تم نہیں سن رہے۔

واقعی بعض اوقات سن رہے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں نہیں سن رہے ہوتے۔اس لیے دونوں کانوں سے سننے کی عادت ڈالو۔مومن اور کافر میں یہی تو فرق ہوتا ہے کہ مومن سن کر مان لیتا ہے اور کافر دیکھ کر مانتا ہے۔ان کو تو گویا عقل ہی نہیں ہوتی۔کافر لوگ آخرت میں یہی تو کہیں گے:

﴿لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾ (الملک:۱۰)

''اگر ہم سنتے اور عقل ہوتی تو ہم جہنم والوں میں سے نہ ہوتے۔''

بسم اللہ کی ''با'' اور اس کے معارف:

اللہ تعالیٰ نے قرآن کو ''بسم اللہ'' سے شروع کیا۔اور بسم اللہ کو کس حرف سے شروع کیا؟ ''با'' سے۔الف سے کیوں نہیں شروع کیا؟......علما نے اس میں بھی نکات لکھے ہیں کہ پروردگار نے ''با'' کو کیوں پسند کیا اور الف کو تنہا چھوڑ دیا۔اس کی کئی وجوہات ہیں:-

⊙ ......ایک وجہ تو یہ ہے کہ الف کھڑا ہوتا ہے، متکبر کی طرح۔کھڑا ہونا تکبر کی نشانی ہے۔اور ''با'' لیٹی ہوئی ہوتی ہے، عاجز بندے کی طرح۔اللہ رب العزت کو الف کا تکبر ناپسند تھا اور ''با'' کی عاجزی پسند تھی۔اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی

ابتدا ''با'' کے حرف سے کی۔

⊙......ایک وجہ یہ ہے کہ الف حروفِ علت میں سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نہیں چاہتے کہ میرے مومن بندے علیل بنیں۔ اس لیے قرآن مجید کی ابتدا کے لیے وہ حرف پسند کیا جو حروفِ علت میں سے نہیں۔

☆......اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کی ابتدا کرتے ہوئے ''با'' کو کس کے ساتھ جوڑا؟ ''با'' کو اسم کے ساتھ جوڑا۔ کس اسم کے ساتھ؟ اللہ کے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ عام حالت میں ''با'' کو دیکھیں تو لیٹی ہوئی ہوتی ہے اور جب اللہ کے اسم کے ساتھ ملا کر لکھیں تو یہ ''با'' بھی کھڑی ہوتی ہے۔ بسم اللہ کے اندر ''با'' کھڑی حالت میں لکھی جاتی ہے۔ تو ''با'' تھی لیٹی ہوئی، پروردگار کو اس کی عاجزی پسند آ گئی اور اس نے اپنے نام کے ساتھ جوڑ دیا۔ مگر نام کے ساتھ جڑنے کی یہ برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس لیٹی ہوئی ''با'' کو بھی کھڑا کر دیا۔ اے پروردگار! جو تیرے نام کے ساتھ جڑ جاتا ہے تو اس کو بھی کھڑا کر دیتا ہے اور جو تیری ذات کے ساتھ جڑ جائے تو اس کو کیسی عزتیں عطا فرمادے گا!؟

☆......اس ''با'' کے اندر ایک پیغام ہے......دیکھیں! کئی حروف میں نقطے بھی ہوتے ہیں۔ ایک نقطہ ''خا'' کے اوپر بھی ہے۔ لیکن وہ اس کے سر پر ہے۔ اور ایک نقطہ ''جیم'' میں بھی ہے۔ وہ اس کے پیٹ میں ہے۔ اور ایک نقطہ ہے ''با'' میں، مگر وہ اس کے نیچے ہے......اس نقطے میں یہ پیغام ہے کہ اے میرے بندے! یہ نقطہ دنیا کا ہے۔ ''خا'' نے اس کو سر پر اٹھایا تو اسے ہم نے چھوڑ دیا۔ ''جیم'' نے اس کو پیٹ میں بسایا۔ اسے بھی ہم نے چھوڑ دیا۔ اور ''با'' نے اسے اپنے نیچے لگایا تو اسے ہم نے پسند کر لیا، تم بھی ساری زندگی دنیا کو اپنے قدموں کے نیچے رکھنا، تجھے بھی ہم ''با'' کی طرح عزتیں عطا فرمائیں گے۔

عزت وذلت ملنے کا معیار:

جھکنے والے بندے کو عزت ملتی ہے اور بڑا بننے والے کو ذلت ملتی ہے۔اس کی مثال یوں سمجھیے: ایک ہے انسان کا سر اور ایک ہیں انسان کے پاؤں ہیں۔ان میں سے اونچا کون ہے؟ سر ہے۔اور نیچا کون ہے؟ پاؤں۔جب انسان کو عزت ملتی ہے اور وہ معافی مانگتا ہے تو وہ سر پکڑتا ہے یا پاؤں پکڑتا ہے؟ پاؤں پکڑتا ہے۔اور جب ذلت ملتی ہے جوتے پاؤں پہ لگتے ہیں یا سر پہ؟ سر پہ لگتے ہیں۔اس میں یہ پیغام ہے کہ دیکھو! جنہوں نے اپنے آپ کو جھکایا تھا، جب عزت ملی تو ان کو ملی اور جو اونچا ہوا تھا، جب ذلت ملی تو اس کو ملی۔ چنانچہ اونچا نہیں ہونا، بلکہ اپنے آپ کو جھکا کے رکھنا چاہیے، کیونکہ اللہ رب العزت کو عاجزی پسند ہے۔

مونچھوں اور پلکوں کے مابین ایک دلچسپ مناظرہ:

کچھ لوگوں نے اپنی مونچھیں بڑھائی ہوئی ہوتی ہیں۔جو مونچھیں منہ کے اوپر ہوتی ہیں ان کو اچھی طرح سے کاٹنا چاہیے اور جو کناروں پر ہوتی ہیں ان کو بڑھا سکتے ہیں۔یہ مونچھیں اٹھی ہوئی ہوتی ہیں اور پلکیں جھکی ہوئی ہوتی ہیں۔ایک مرتبہ مونچھوں میں اور پلکوں میں مناظرہ ہو گیا۔

مونچھیں کہنے لگیں: ہم اعلیٰ ہیں۔گویا انہوں نے بڑائی کا دعویٰ کر دیا۔ چنانچہ جیسے وہ دعویٰ کرتی گئیں، پلکیں ان کا جواب دیتی گئیں۔ بالآخر مونچھوں نے کہا: دیکھو! انسان اپنی شان دکھانے کے لیے مجھے تاؤ دیتا ہے۔...... جب ایک دوسرے کے سامنے اپنی بڑائی ظاہر کرنا ہو تو یہ دنیا دار قسم کے لوگ اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہیں...... گویا مونچھوں نے کہا: انسان کی شان ہم سے ہے۔

پلکوں نے جواب دیا: جناب! جب ادب اور تعظیم کا وقت آتا ہے تو وہاں پلکوں

کا نام آتا ہے۔...... ذرا بتائیں کہ جب ادب اور تعظیم کا وقت آتا ہے تو کیا کوئی یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنی مونچھیں نیچی کر دیں؟ ہر کوئی پلکیں بچھانے کی بات کرتا ہے: ؎

اے بادِ صبا! کچھ تو ہی بتا مہمان جو آنے والے ہیں
کلیاں نہ بچھانا راہوں میں ہم پلکیں بچھانے والے ہیں

مونچھوں نے کہا: جناب! جوانی کی معرفت ہم سے ہے۔ جوانی کی پہچان ہم سے ہے۔

پلکوں نے کہا: جی! قینچی بھی تو تم پر ہی چلائی جاتی ہے۔ تمہیں ہی کاٹا جاتا ہے۔

مونچھوں نے کہا: دیکھو! لوگ ہمیں بنا سنوار کر رکھتے ہیں، یعنی وہ بل دے کر رکھتے ہیں۔

پلکوں نے کہا: جب انسان کی ناک بہتی ہے تو پھر تمہارے ہی اوپر گرا کرتی ہے۔

تو مونچھوں کو بڑا بننے کی یہ سزا ملی۔ دیکھو! کیسی سزا دی اللہ نے۔ ناک صاف کرنے لگو تو مونچھوالوں کی مونچھوں پہ لگ جاتی ہے۔ مومن کو تو صاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے اس کو تو کوئی پروانہیں ہوتی۔ لیکن جو بے چارے رکھتے ہیں ان کو بڑی پریشانی ہوتی ہے۔

بکری کی ''میں میں'' کیسے نکلی؟

بکری ایک جانور ہے۔ وہ جب آواز نکالتی ہے تو ''میں میں'' کہتی ہے۔ اس ''میں'' میں وہ گویا بڑائی کا دعویٰ کر رہی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی 'میں' ناپسند آئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اچھا! تیرا بندوبست کرتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مومن کے لیے حلال کر دیا۔ پھر ماشاءاللہ مومن نے

......اس کے گلے پر چھری چلائی

......پھر اس کی کھال اتاری

......پھر اس کے تکے بوٹی کیے

......پھر ان کو بھونا، بھون کے پکایا، پکا کے بتیس دانتوں نے چبایا اور

......خوب اچھی طرح کھایا۔

اس کے بعد اس کی آنتیں بچ گئیں۔ ان کو کسی بندے نے دھوپ کے اندر رکھ کر خشک کیا...... جب اس کی آنت خشک ہو جاتی ہے تو اس کو روئی دھننے کی مشین میں استعمال کیا جاتا ہے۔...... چنانچہ جب یہ خشک ہو کر روئی دھننے کی مشین میں لگتی ہے اور اس کو ہلایا جاتا ہے تو اس میں سے ''تو تو'' کی آواز نکلتی ہے۔

ایک بزرگ نے اس میں ایک نکتہ نکالا کہ بکری ''میں میں'' کرتی تھی، اس کی یہ ''میں'' اللہ تعالیٰ کو ناپسند آئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی سزا دی کہ ٹکڑے کروائے، آگ کے اوپر اس کو پکوایا، اس کو بتیس دانتوں میں چبوایا اور جو کچھ اس کا باقی بچا اس کو دھوپ میں رکھوایا۔ گویا اتنا مجاہدہ کروایا کہ اس کے اندر سے بے اختیار ''تو تو'' کی آواز نکلنے لگ گئی۔ اے بندے! تو خود ہی ''تو تو'' کہہ لے، ''میں میں'' کرے گا تو تیرے ساتھ بھی یہی حشر ہو گا۔

جو ''میں میں'' کرتے ہیں وہی قربانی کے بکرے بنتے ہیں۔ ان کو بھی اللہ تعالیٰ اچھی طرح جھنجوڑا کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اس جینے سے تو مر جانا اچھا تھا۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم بھی ''میں میں'' کی بجائے ''تو تو'' کریں اور کہہ دیں:

اللہ! تجھے ہی عظمت سجتی ہے۔

''مینا'' پرندے کی پسندیدگی کی وجہ:

ایک پرندہ ہے ''مینا''۔ اس کو لوگ گھر میں رکھنا پسند کرتے ہیں اور صبح شام اس کی خدمت کرتے ہیں۔ وہ کس لیے؟ کہ جب وہ بولتی ہے تو ''میں ناں، میں ناں'' کہتی ہے۔ اس سے اس کا نام ہی ''مینا'' پڑ گیا۔ گویا وہ اپنی ذات کی نفی کر رہی

ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کا نفی کرنا پسند آ گیا۔ اب اس پر کسی شاعر نے شعر لکھا:

بکری کرے میں میں، گلے چھرے پھراوے
مینا کرے میں ناں میں ناں، سب کے من کو بھاوے

کیا ہم ''میں میں'' والوں میں سے بنیں گے یا ''میں ناں میں ناں'' والوں میں سے؟ ''میں ناں میں ناں'' والوں میں سے بننا چاہیے۔ اس لیے کہ بندے کو عاجزی سجتی ہے اور عظمت فقط اللہ رب العزت کو زیبا ہے۔ ہم تو اس کے سامنے مسکین بندے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو جتنا جھکائیں اتنا اچھا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں۔

عاجزی سے استعداد پیدا ہوتی ہے:

یاد رکھیں! جب عاجزی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ استعداد بھی دے دیتے ہیں۔ اس نکتے پر غور کرنا...... سیدنا صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ میں عاجزی تھی، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو استعداد اتنی دے دی کہ کافروں کے سردار ابو جہل نے معراج کا واقعہ سنایا اور وہ اس پر ایمان لے آئے۔ اس کے برعکس ابو جہل میں تکبر تھا۔ اس نے معراج کا واقعہ نبی علیہ السلام کی مبارک زبان سے سنا، استعداد نہیں تھی، لہٰذا ایمان لانے کی توفیق ہی نہ ملی...... یہ جاہلوں کے سردار سے سن کر بھی مان لیتے ہیں اور وہ نبیوں کے سردار کی زبان سے سن کر بھی قبول نہیں کر پاتا۔ اس لیے کہ جس انسان کے اندر تکبر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی استعداد کو ختم کر دیتے ہیں۔

نمرود کا تکبر کیسے ٹوٹا؟

نمرود نے بڑائی کا دعویٰ کیا تھا۔ دیکھا! پروردگار نے اسے کیسی سزا دی۔ ایک مچھر، وہ بھی لنگڑا...... ناک کے اندر چلا گیا۔ جب وہ دماغ کے اندر جا کر ڈنک لگاتا تھا تو اسے درد ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ نوکروں سے کہتا تھا کہ ذرا میرے سر کی خدمت کر

دیجیے۔......کیا مطلب؟......کہ دو چار تھپڑ لگا دیجیے۔ جب وہ تھپڑ لگاتے تھے تو مچھر رک جاتا تھا، اور جب تھپڑ لگنا بند ہو جاتے تو وہ کارروائی شروع کر دیتا......وہ مچھر اس دور کا مجاہد تھا۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی تو دین والوں سے دین کا کام لیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مجاہد کھڑا کر دیتے ہیں۔......جب تک تھپڑ لگتے رہتے تو خاموش بیٹھا رہتا اور جب لگنے بند ہو جاتے تو کارروائی تیز کر دیتا۔

جب تھپڑ مارنے والے تھک گئے تو وہ کہنے لگے: جناب! ہم سے تو اب تھپڑ نہیں مارے جاتے۔ وہ سن کر بڑا پریشان ہوا۔ چنانچہ اس نے وزیر سے کہا کہ اب تو کوئی تھپڑ مارنے والا ہی نہیں رہا۔ اس نے کہا: بادشاہ سلامت! میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ اس نے پوچھا: وہ کیا؟ وزیر کہنے لگا؟ جناب! آپ سے ملنے والے لوگ بہت کثرت کے ساتھ آتے جاتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ آپ کو سلام کرنے کی بجائے آپ کے سر پر تھپڑ مارا کریں۔

اس نے قانون بنا دیا۔ چنانچہ نمرود کے دربار میں جو بھی آتا تھا وہ سلام کرنے کی بجائے اس کے سر پر تھپڑ لگاتا تھا۔ دیکھا! اللہ تعالیٰ نے اس کی ''میں'' کیسے نکالی!

تصوف کا بنیادی مسئلہ:

تصوف کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اپنی بڑائی نکل جائے اور اللہ کی عظمت دل میں آ جائے۔ جس نے اس کو سمجھ لیا اس نے سارا تصوف سمجھ لیا۔ پھر وہ

......میں کی بات نہیں کر سکتا

......کوئی اونچا بول نہیں بول سکتا

......وہ اللہ کا عاجز اور مسکین بندہ بن کر رہے گا۔

کسی شاعر نے کیا خوب کہا: ؎

یہ دل کی ہے آواز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
اس پر ہے مجھ کو ناز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں
کچھ ہونا میرا ذلت و خواری کا سبب ہے
یہ ہے میرا اعزاز کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں

اس سبق کو اچھی طرح سیکھ لو کہ ہمارا اعزاز اسی میں ہے کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں۔ ورنہ آج تو حالت یہ ہے کہ لوگ خواب دیکھ کر اپنے معتقد بن جاتے ہیں۔ او جی! میں نے خواب دیکھا تو مجھے یوں نظر آیا...... اپنے عمل اور کرتوت سامنے نہیں ہوتے..... بس اپنے خوابوں کی وجہ سے اپنے معتقد بنے پھر رہے ہوتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عاجزی:

جھکنے کا یہی سبق نبی علیہ السلام سے آگے امت کو ملا چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے اندر بھی کمال درجے کی عاجزی تھی۔ مثال کے طور پر:

⦿ ......سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اللہ سے دعا مانگتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِىْ فِىْ عَيْنِىْ صَغِيْرًا وَّ فِى اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا

''اے اللہ! مجھے اپنی نگاہوں میں چھوٹا بنا دے اور لوگوں کی نگاہوں میں مجھے بڑا بنا دے۔''

اس لیے کہ اگر بندہ لوگوں کی نگاہوں میں ہی چھوٹا ہو جائے تو وہ تو دین کی بات ہی نہیں مانیں گے۔ وہ تو دعوت ہی قبول نہیں کریں گے، لوگ تو دعوت اس کی قبول کرتے ہیں جس کو بڑا سمجھتے ہیں، داعی کے لیے اس میں سبق ہے۔ اگر وہ اس کو بے وقعت سمجھنے لگیں تو اس کی بات کو کیسے قبول کریں گے۔ اسی لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دعا مانگی۔

⦿ ......سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا: جی آپ کون ہیں؟ فرمانے لگے:

''میں مسلمانوں میں سے ایک عام آدمی ہوں۔''

...... یہ نہیں کہا کہ میں نبی علیہ السلام کا داماد ہوں

...... یہ نہیں کہا کہ میں خلیفہ وقت ہوں

...... یہ نہیں کہا کہ میں فاتح خیبر ہوں

...... یہ نہیں کہا کہ میں حیدر کرار ہوں

بلکہ جب اپنا تعارف کروایا تو کس انداز سے کروایا؟ کہ میں مسلمانوں میں سے ایک عام آدمی ہوں۔ اس کو عاجزی کہتے ہیں۔

اہلِ وصف حضرات کا مقامِ عجز:

یاد رکھیں! عاجزی یہ نہیں ہوتی کہ عمل تو متکبر لوگوں والے کرے اور زبان سے اپنے آپ کو چھوٹا کہتا رہے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہاں! دل سے اپنے آپ کو کمتر سمجھے اور دوسروں کو اپنے سے بہتر سمجھے۔ جب یوں عاجزی پیدا ہو گی تو اللہ رب العزت کی طرف سے بھی رحمت ہو گی ؎

زمیں کی طرح جس نے عاجزی و انکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں ہو کر

جو زمین کی طرح عاجز بنتا ہے، پھر اللہ کی رحمتیں آسمان بن کر اس کو ڈھانپ لیا کرتی ہیں۔

کسی شاعر نے تواضع پر عجیب شعر کہا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

جو اہلِ وصف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے رہتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

جب صراحی جھکتی ہے تو پھر پیمانہ بھر دیتی ہے۔

تواضع کا طریقہ سیکھ لو لوگو صراحی سے
کہ جاری فیض بھی ہے اور جھکی جاتی ہے گردن بھی

یہ ہے تواضع!......اور یہ ہے اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا۔

امامِ اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی عاجزی:

امامِ اعظم کے اندر بڑی تواضع تھی۔ان کی والدہ ایک بزرگ حضرت ابوزرعہ سے مسئلے پوچھا کرتی تھیں کیونکہ وہ بڑی عمر کے تھے۔وہ کئی مرتبہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے کہتیں کہ میں نے ایک مسئلہ پوچھنا ہے مجھے ابوزرعہ کے پاس لے جاؤ۔ چنانچہ امام صاحب ان کو اونٹ پر سوار کراتے اور لے کر ان کے پاس جاتے۔

اب ان کی والدہ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا اونچا سنتی تھیں۔اس لیے وہ خود حضرت کو بتاتے کہ میری والدہ یہ مسئلہ پوچھنا چاہتی ہیں۔وہ آگے سے کہتے کہ اس مسئلے کا جواب تو آپ ہی بتا دیجیے۔اس طرح امام صاحب ان کے مسئلے کا جواب بتا دیتے اور وہ اونچی آواز سے ان کی والدہ کو مسئلہ سنا دیتے۔امام صاحب پوری زندگی اپنی والدہ کو لے جاتے رہے اور ان کو یہ ظاہر نہ کیا کہ امی! آپ کو جو مسئلے کا جواب دینے والے ہیں وہ مجھ سے جواب پوچھ کر آپ کو بتایا کرتے ہیں۔وہ یہی سمجھتے تھے کہ میری والدہ کی تسلی ان سے مسئلہ پوچھنے سے ہوتی ہے لہٰذا جب انہی کی زبان سے سن لیں گی تو میری والدہ کو سکون ملے گا، تسلی ملے گی۔لہٰذا انہوں نے ساری زندگی اس بات کو چھپائے رکھا۔ان کی اس تواضع کو اللہ تعالیٰ نے اتنا پسند کیا کہ ان کو ''امام اعظم'' کے نام سے دنیا میں شہرت عطا فرما دی۔

ترکِ عبودیت اور طرزِ ربوبیت:

ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ رب العزت سے ایک بڑی عجیب بات کی۔

قَالَ مُوْسٰی اِلٰهِی اَتَرْزُقُ فِرْعَوْنَ وَهُوَ يَدَّعِي الرَّبُوْبِيَّةَ

''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے اللہ! کیا آپ فرعونوں کو رزق دیتے ہیں، حالانکہ وہ تو ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے؟''

فَاَوْحَی اللّٰہُ اِلَیْہِ

اللہ نے ان پر وحی نازل کی:

یَا بْنَ عِمْرَانَ لَوْ تَرَکَ فِرْعَوْنُ الْعُبُوْدِیَّۃَ مَا اَتْرُکُ الرَّبُوْبِیَّۃَ

''اے عمران کے بیٹے! اگر فرعون نے عبودیت کو ترک کر دیا ہے تو میں نے ربوبیت کو تو ترک نہیں کیا۔ (میں پروردگار تو اس کو رزق دیتا رہوں گا)۔''

جو پروردگار ایسے دشمن کو بھی رزق دے دیتا ہے تو وہ پروردگار اپنے غلاموں کو رزق کیوں نہیں عطا فرمائے گا۔

عاجزی کے ساتھ دامن پھیلا دیں:

ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ کی عظمتوں کو دل میں لے کر اس کے سامنے اپنے دامن کو پھیلائیں۔ اور سچے دل کے ساتھ اللہ سے دعا مانگیں۔ اس کے اچھے اچھے نام لے کر، اس کی عظمتیں بیان کر کے، اس کی تعریفیں کر کے، یقین کے ساتھ ہم جو بھی فریاد کریں گے، اللہ تعالیٰ ہماری فریاد کو یقیناً قبول کریں گے۔

یاد رکھنا! دنیا میں جس کے پاس مال ہوتا ہے وہ کسی سے یہ بات سننا پسند نہیں کرتا کہ کوئی اس کے سامنے کھڑا ہو کر یہ کہہ دے کہ میں اس کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا تھا اور اس کے دروازے سے مجھے بھیک نہیں ملی تھی۔ ارے! دنیا میں جس کے پاس مال پیسہ ہو، وہ بھی فقیر کی زبان سے یہ سننا پسند نہیں کرتا کہ میں نے اسکے در پر صدا لگائی تھی، مجھے دینے والا کوئی نہیں تھا، وہ بھی کہتا ہے کہ جو مانگتے ہو لے جاؤ۔ اگر دنیا کا امیر بات سننا پسند نہیں کرتا تو پروردگار عالم بھی قیامت کے دن کسی بندے سے یہ سننا پسند نہیں کریں گے کہ اے اللہ! میں دنیا میں تیرے در پر سوال کرتا رہا مگر تو نے میری

دعا قبول نہیں کی۔ اس لیے اللہ رب العزت بندے کی ہر دعا کو قبول کرتے ہیں۔

......یا تو دنیا میں پوری کر دیتے ہیں

......یا اس کے بدلے کوئی مصیبت ہٹا دیتے ہیں

......یا پھر اس کے بدلے قیامت کے دن اجر عطا فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بھی یہ بات سننا پسند نہیں فرمائیں گے کہ اللہ! تیرے در پر سوال کیا تھا اور میرا دامن خالی رہا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اتنا اجر عطا فرمائیں گے کہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ بندہ جب اس اجر و ثواب کو دیکھے گا تو دعا کرے گا: اے اللہ! کاش! دنیا میں میری کوئی بھی دعا قبول نہ ہوتی اور سب دعائیں ذخیرہ بن جاتیں اور آج قیامت کے دن مجھے اتنا اجر اور بدلہ مل جاتا۔

جب پروردگار اتنا کریم ہے تو ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو اس کے سامنے جھکا دیں۔ جب کوئی مصیبت ہو، پریشانی ہو یا تفکرات ہوں تو ہم رات کو دو رکعت نفل پڑھیں اور اپنے رب کے سامنے:

......ہاتھ پھیلا کر دعائیں کریں

......دامن پھیلا کر دعائیں کریں

......سجدے میں جا کر دعائیں کریں

ہم جتنی عاجزی اختیار کریں گے اور اللہ رب العزت کی عظمت بیان کریں گے تو پروردگار ہماری دعاؤں کو قبول کر لیں گے۔ پروردگار ہمیں کامیاب و کامران زندگی عطا فرمادے اور ہمارے دل میں اپنی عظمت نقش فرمادے۔ (آمین ثم آمین)

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰه﴾

(البقرة:١٦٥)

وجوہات محبت

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

مجددی مدظلہم

اقتباس

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ (البقرۃ:۲۵۷)

''اللہ دوست ہے ایمان والوں کا۔''

حق تو یہ بنتا تھا کہ یوں کہہ دیا جاتا کہ ایمان والوں نے کلمہ پڑھا اور اب یہ اللہ تعالیٰ کے دوست بن گئے۔ مگر نہیں، محبت کی نسبت اپنی طرف پسند فرمائی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دوست ہے ایمان والوں کا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کتنی محبت ہے؟ اب اس محبت کے جواب میں ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اللہ رب العزت سے محبت کریں۔ ہمارے اندر بھی محبت الٰہی کی گرمی اور شدت محسوس ہونی چاہیے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

وجوہاتِ محبت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ٥ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٥

﴿وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰه﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ٥ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ٥

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

اللہ تعالیٰ کی ذاتی محبت اور ذاتی عداوت:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰه﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

’’اور ایمان والوں کو اللہ رب العزت سے شدید محبت ہوتی ہے۔‘‘

اللہ رب العزت نے انسانوں کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا فرمایا۔ ان انسانوں کی تقسیم اللہ تعالیٰ کی نظر میں دو طرح سے ہے۔

﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ فَمِنكُم كَافِرٌ وَّ مِنكُمْ مُّؤمِنٌ﴾

’’وہ ذات جس نے تمہیں پیدا کیا، تم میں سے کچھ ماننے والے اور کچھ نہ ماننے والے ہیں۔‘‘

جو ایمان لے آئے، اللہ رب العزت کو ان سے ذاتی محبت ہوتی ہے اور جنہوں نے کفر کیا، اللہ رب العزت کو ان سے ذاتی عداوت ہوتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین کر

لیجیے کہ اللہ رب العزت کو ایمان والوں کے ساتھ ذاتی محبت ہے، کفر اور کافروں سے ساتھ ذاتی عداوت ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو منع کر دیا کہ تم کافروں کے ساتھ مشابہت اختیار نہ کرو، ورنہ ہم تمہارا حشر بھی انہی کے ساتھ کر دیں گے۔

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ

''جو جس قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے اسی میں سے ہوتا ہے''

کافروں کی مشابہت پر پکڑ:

انڈیا میں ایک بڑی عمر کے آدمی تھے۔ وہ فوت ہو گئے۔ کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو پوچھا: جی! آگے کیا بنا؟ کہنے لگے: میں سخت عذاب میں مبتلا ہوں۔ اس نے پوچھا: وجہ کیا بنی؟ کہنے لگے: ایک مرتبہ ہندوؤں کی ہولی کا دن تھا اور وہ ایک دوسرے پر رنگ ڈالتے پھر رہے تھے۔ میں اپنے گھر سے کسی دوسری جگہ پر جا رہا تھا۔ راستے میں مجھے پان کھاتے ہوئے تھوک پھینکنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس وقت مجھے اپنے سامنے ایک گدھا نظر آیا، میری طبیعت میں کچھ ایسی بات پیدا ہوئی کہ میں نے یہ کہہ دیا: ارے گدھے! تجھے کسی نے نہیں رنگا، آ میں تجھے رنگ دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنی پان والی تھوک گدھے پر پھینک دی۔ اللہ تعالیٰ نے میرے اس عمل کر پکڑ لیا کہ تم نے کافروں کے عمل کے ساتھ مشابہت اختیار کی، چنانچہ اس وجہ سے میری قبر کو جہنم کا گڑھا بنا دیا گیا۔

ایمان والوں سے اللہ کی ذاتی محبت کی دلیل:

کسی نے حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ سے پوچھا: حضرت! اللہ رب العزت کو ایمان والوں سے ذاتی محبت ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟ انہوں نے فرمایا:

''محبت کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ محب اپنے محبوب کو جتنا بھی دے دے، وہ اسے

تھوڑا سمجھے اور محبوب اسے اگر تھوڑا سا بھی کچھ دے تو اسے بہت زیادہ سمجھے۔"

اس نے کہا: جی! بات تو اصولی ہے۔ پھر حضرت نے فرمایا: کہ قرآن مجید پر نظر ڈالو، اللہ رب العزت نے انسان کو کتنی نعمتیں عطا کیں کہ اگر ہم ان کو گننا بھی چاہیں تو ہم گن بھی نہیں سکتے۔ اتنی ان گنت نعمتیں دینے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ

"آپ فرما دیجیے، دنیا کی متاع تھوڑی سی ہے۔"

اور جب اس کے بدلے میں مومن نے اللہ رب العزت کو یاد کیا...... حالانکہ مومن کی زندگی بھی محدود اور اس کا عمل بھی محدود...... لیکن چونکہ محبت تھی، اس لیے مومن کا اللہ کو یاد کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند آیا کہ فرمایا:

﴿ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّ الذّٰكِرَات ﴾

"اور کثرت کے ساتھ ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ لاتعداد نعمتیں دے کر بھی ان کو قلیل کہا اور اپنے محبوب بندے کے تھوڑے ذکر کو بھی کثیر کہا، یہ اللہ تعالیٰ کی ذاتی محبت کی دلیل ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ (البقرة:۲۵۷)

"اللہ دوست ہے ایمان والوں کا۔"

حق تو یہ بنتا تھا کہ یوں کہہ دیا جاتا کہ ایمان والوں نے کلمہ پڑھا اور اب یہ اللہ تعالیٰ کے دوست بن گئے۔ مگر نہیں، محبت کی نسبت اپنی طرف پسند فرمائی اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ دوست ہے ایمان والوں کا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کتنی محبت ہے؟ اب اس محبت کے جواب میں ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اللہ رب العزت سے محبت کریں۔ ہمارے اندر بھی محبت الٰہی کی گرمی اور شدت محسوس

ہونی چاہیے۔

وجوہاتِ محبت

علماء نے لکھا ہے کہ محبت کرنے کی چند وجوہات ہوتی ہیں۔ ذرا ان کا جائزہ لیتے ہیں:

(۱)...... حسن و جمال:

انسان کو کسی چیز کی خوب صورتی دیکھ کر اس سے محبت ہوتی ہے۔ چاہے

......شخصیت خوب صورت ہو

......عمارت خوب صورت ہو

......لباس خوب صورت ہو

......کوئی منظر خوب صورت ہو

جس چیز میں بھی جمال ہوگا انسان کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا جائے گا۔ اللہ رب العزت کے جمال کا ہم کیا اندازہ لگا سکتے ہیں؟ حدیث قدسی میں فرمایا گیا:

اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَّ يُحِبُّ الْجَمَال

"اللہ رب العزت خوب صورت ہیں اور خوب صورتی کو پسند فرماتے ہیں۔"

سوچنے کی بات ہے کہ جس ذات نے خوب صورتی کو پیدا کر دیا اس کے اپنے حسن و جمال کا کیا عالم ہوگا؟

جنت کا تذکرہ کرتے ہوئے علما نے ایک عجیب بات لکھی: کہ جنتی جب جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں کے خدام......حور و غلمان...... کے حسن و جمال کو دیکھیں گے تو مبہوت رہ جائیں گے اور ستر سال تک ٹکٹکی باندھ کر ان کو دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور

جب وہاں زندگی گزارنا شروع کر دیں گے تو ایک وقت ایسا آئے گا جب اللہ رب العزت جنتیوں کو اپنا دیدار کروائیں گے۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ وہ دیدار ایسے ہی ہوگا جیسے لوگ چاند کو دیکھتے ہیں۔ کسی کو دیکھنے میں رکاوٹ نہیں ہوتی۔ وہ دیدار

......بے جہت ہوگا

......بے کیف ہوگا

......بے شبہ ہوگا

......بے مثال ہوگا

لیکن جب اللہ رب العزت کا دیدار ہوگا تو اس وقت نور کی بارش ہوگی اور اس نور کی بارش کی وجہ سے ایمان والوں کے سراپا پر نور کی تہہ چڑھ جائے گی۔ جب آندھی کے وقت انسان باہر کھڑا ہو تو اس کے جسم اور کپڑوں پر مٹی کی تہہ چڑھ جاتی ہے۔ اللہ رب العزت کا جب دیدار نصیب ہوگا تو نور کی ایسی بارش ہوگی کہ ایمان والوں کے سراپا پر نور کی ایسی تہہ آجائے گی جس کی وجہ سے ان جنتیوں کے حسن و جمال میں اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ جب یہ لوٹ کر گھروں میں آئیں گے تو حوریں اور غلمان ان کے حسن و جمال کو ستر سال تک ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہ جائیں گے۔......اب دیکھیے! اللہ رب العزت کے حسن و جمال کو دیکھنے والوں کا اپنا حسن و جمال جب اتنا ہو جائے گا تو اللہ رب العزت کے حسن و جمال کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں؟ اس لیے اس دنیا میں

......جتنا اللہ رب العزت کو چاہا گیا

......جتنا اللہ رب العزت سے محبت کی گئی

......جتنا اللہ رب العزت کو تنہائیوں میں یاد کیا گیا

......جتنا اس کے لیے اس کے بندے اداس ہوئے

......جتنا اس کے سامنے پیشانیاں ٹیکی گئیں

......جتنا اس کے سامنے دامن پھیلائے گئے

......جتنا اس کے سامنے دل کے راز کھولے گئے

......جتنا اللہ کے نام پر اپنی جانوں کو قربان کیا گیا

کائنات میں کوئی دوسری ہستی ایسی موجود نہیں ہے۔ یہ اللہ رب العزت ہی کی شان ہے۔

ہم ہوئے ، تم ہوئے کہ میرِ ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

سب اللہ رب العزت کو چاہنے والے ہیں۔......اگر حسن و جمال کے نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اللہ رب العزت اس بات کے زیادہ حق دار ہیں کہ اس کے بندے سب سے زیادہ محبت اسی کے ساتھ کریں۔

(۲)......فضل وکمال:

محبت کرنے کی دوسری وجہ کسی کا کمال ہے۔ اگر کوئی بندہ کسی میدان میں کامل ہو تو دنیا اس سے محبت کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کرکٹ کھیلنے والے چھوٹے چھوٹے بچے، بڑے بڑے کھلاڑیوں کے نام یاد کیے پھرتے ہیں، انہوں نے ان کو دیکھا نہیں ہوتا، فقط سنا ہوتا ہے، سن سنا کر ان کو کھلاڑیوں کے ساتھ ایسی محبت ہوتی ہے کہ ان کے ناموں کے قمیص پہنے پھرتے ہیں۔ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ان کے کمال کی وجہ سے۔

اسی طرح ہم نے

......سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا

......سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا

......سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا

......سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو نہیں دیکھا

لیکن ہم نے ان کے فضل و کمال کی داستانیں سنی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ بن دیکھے اتنی محبت کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے سگے ماں باپ سے بھی زیادہ ان ہستیوں کے ساتھ محبت ہے۔ تو معلوم ہوا کہ انسان کسی کے کمال کی وجہ سے بھی اس سے محبت کیا کرتا ہے۔

اللہ رب العزت کے کمال کے بارے میں کیا کہنا......! اس ذات کے بارے میں نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً اِلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ

''اے اللہ! میں آپ کی تعریفوں کا احاطہ نہیں کرسکتا، آپ ایسے ہی ہیں جیسے آپ نے اپنی تعریفیں خود آپ بیان فرمائی ہیں۔''

اور اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریفیں کیسے بیان فرمائیں؟...... قرآن مجید کی طرف رجوع کیجیے! اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکھف:۱۰۹)

''اے میرے محبوب! آپ فرما دیجیے: کہ اگر ساری دنیا کے سمندروں کا پانی سیاہی بن جاتا، اور اس سیاہی سے تیرے رب کی تعریفیں لکھنی شروع کی جاتیں، تو ایک وقت آتا کہ یہ سیاہی تو ختم ہو جاتی، مگر تیرے رب کی تعریفیں ختم نہ ہوتیں۔''

ایک دوسرے مقام پر اس سے ذرا آگے بڑھ کے بات کی۔ ارشاد فرمایا:

وَلَوْ اَنَّمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ

سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللّٰهِ ؕ (لقمٰن:۲۷)

’’(اے میرے محبوب) آپ فرما دیجیے: اگر ساری دنیا کے سمندروں کا جتنا پانی ہے اتنے سات سمندر اور ہوتے اور جتنا ساری دنیا کے درخت ہیں ان کی قلمیں بنا دی جاتیں، پھر ان قلموں سے اور اس سیاہی سے تیرے رب کی تعریفیں لکھنی شروع کر دی جاتیں، تو ایک وقت آتا کہ یہ قلمیں ٹوٹ جاتیں اور یہ سیاہی ختم ہو جاتی، لیکن تیرے رب کی تعریفیں کبھی ختم نہ ہوتیں۔‘‘

ایسے پروردگار کے کمالات کوئی کیا حصار کر سکتا ہے؟ اگر اس نکتہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو دل گواہی دیتا ہے کہ اگر محبت کرنی بھی ہو تو کس سے کی جائے؟ اللہ رب العزت سے کی جائے۔ وہی اس بات کا زیادہ حق دار ہے۔

(۳)......مال ومنال:

محبت کرنے کی تیسری وجہ کسی کا مال ومنال ہوتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی امیر آدمی اگر کسی کو اپنا ایڈریس کارڈ دے دے تو وہ جیب میں تعویذ کی طرح لیے پھرتا ہے اور لوگوں کو دکھاتا پھرتا ہے کہ جی! میرا فلاں رشتہ دار وزیر ہے، اور فلاں رشتہ دار امیر ہے۔ لوگ ان کے مال ومنال کی وجہ سے ان سے ساتھ رشتہ داریوں پر ناز کرتے ہیں۔

اللہ رب العزت کے مال ومنال کے بارے میں کیا کہنا! جس نے خود ارشاد فرمادیا:

﴿وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (المنافقون:۷)

’’اور آسمان اور زمین کے سب خزانے اللہ رب العزت کے لیے ہیں۔‘‘

ایک دوسری جگہ پر فرمایا:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُه وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ

''اور جو کوئی بھی چیز ہے، اس کے ہمارے پاس خزانے ہیں، اور ہم ایک معلوم اندازے کے مطابق اسے اتارتے ہیں۔''

تو اللہ رب العزت کے خزانے بھی بے انتہا ہیں۔ اگر اس نکتہءِ نظر سے دیکھا جائے تو بھی دل فیصلہ کرتا ہے کہ اگر انسان محبت کرنا بھی چاہے تو کس سے کرے؟ اللہ رب العزت سے کرے۔

(۴)......احسان:

محبت کرنے کی چوتھی اور آخری وجہ کسی کا احسان ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ انسان اپنے محسن سے فطری طور پر محبت کرتا ہے۔...... انسان تو پھر بھی انسان ہے، جانور بھی اپنے محسن کے ساتھ محبت کرتے ہیں ...... عربی کا مقولہ ہے:

جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ اِلٰی حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیْهَا

''اللہ تعالیٰ نے دلوں کی فطرت ہی ایسی بنا دی کہ جو ان پر احسان کرے، یہ ان سے محبت کرتے ہیں۔''

اسی لیے کہا گیا:

اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ

''انسان تو احسان کا بندہ ہوتا ہے۔''

اب ہم ذرا سوچیں کہ ہم پر اللہ رب العزت کے کتنے احسانات ہیں۔ ہم تو یقیناً ان احسانات کا شمار بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے، یہ ہمارا اپنا نہیں، یہ ہمارے مالک کا کرم ہے اور مالک کا احسان ہے۔

محترم جماعت! اگر اللہ رب العزت ہمیں

...... بینائی نہ دیتے تو ہم اندھے ہوتے

...... گویائی نہ دیتے تو ہم گونگے ہوتے

......دماغ نہ دیتے تو ہم پاگل ہوتے

......صحت نہ دیتے تو ہم بیمار ہوتے

......ہاتھ پاؤں نہ دیتے تو ہم لولے لنگڑے ہوتے

......عزت نہ دیتے تو ہم ذلیل ہوتے

......اولاد نہ دیتے تو لاولد ہوتے

معلوم ہوا کہ ہم جتنی عزتوں بھری زندگی گزارتے ہیں یہ سب کا سب اس مالک کا کرم اور احسان ہی تو ہے۔

احساناتِ خداوندی کی ایک مثال:

ہم تو اپنے پروردگار کے احسانات میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ان احسانات کا اندازہ اس بات سے لگا لیجیے کہ انسان کے دماغ سے اس کے پورے جسم کے اندر جو پیغامات جاتے ہیں اس کے لیے وائرنگ کی گئی ہے۔اس وائرنگ کو اتنی خوبی کے ساتھ کیا گیا کہ ہر تار، دوسری تار سے جدا ہے۔انگلش میں اسے Nerve کہتے ہیں۔جب بجلی کی تاریں اکٹھی جا رہی ہوں تو ایک تار، دوسری تار سے جدا (انسولیٹ) کی ہوتی ہے۔اسی طرح وہ نروبھی ایک دوسرے سے انسولیٹیڈ ہیں، لیکن یہ اتنی لمبی وائرنگ کی گئی ہے کہ سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے اگر ایک انسان کی نروز کو نکالا جائے اور ہر نرو کو علیحدہ کر کے دوسرے نرو کے ساتھ گرہ باندھی جائے تو یہ سلسلہ اتنا لمبا بن جائے گا کہ پوری زمین کے گرد دو مرتبہ چکر لگ سکے گا۔اتنی وائرنگ ایک بندے کے اندر استعمال کی گئی ہے۔اگر ان سب تاروں میں سے کسی ایک تار میں کوئی نقص پیدا ہو جائے تو انسان کو کوئی نہ کوئی عضو کام کرنا چھوڑ جائے۔یہ اللہ رب العزت کا کتنا بڑا کرم ہے کہ ہماری سب نروز ٹھیک کام کر رہی ہیں۔ہم تو ساری زندگی سجدے میں پڑے رہیں تو ہم اپنے مالک کا احسان نہیں چکا سکتے۔تو معلوم ہوا

کہ اگر اس نکتہء نظر سے بھی جائزہ لیا جائے تو دل سے یہ آواز نکلتی ہے کہ اے بندے! تجھے چاہیے کہ تو اپنے مالک کے ساتھ سچی محبت کر لے۔

محبت الٰہی کا غلبہ مطلوب ہے:

یہی بات اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائی:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہوتی ہے۔''

یہ جو ''شدید'' کا لفظ ہے، یہ ہمیں کچھ بتا رہا ہے۔ یہ نہیں کہ ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے۔ نہیں، محبت تو انسان کے دل میں بہت چیزوں کی ہوتی ہے۔......دیکھیں! مال سے محبت ہونا، اولاد سے محبت ہونا، ماں باپ سے محبت ہونا، پیر استاد سے محبت ہونا، یہ ایک قدرتی سی چیز ہے......اللہ تعالیٰ نے ان محبتوں سے منع نہیں کیا، ان کی اَحبّیت (زیادہ محبت) سے منع فرمایا ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ﴾ (التوبۃ:۲۴)

معلوم ہوا کہ اگر ان تمام چیزوں کی محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے زیادہ ہوگی تو اللہ رب العزت کی طرف سے ہمارے اوپر پکڑ آئے گی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی محبت ہر چیز کے اوپر غالب ہونی چاہیے۔ یعنی یہ محبتیں رہیں، لیکن جب اللہ کی طرف جانے کا وقت آئے تو انسان ان محبتوں پر پاؤں رکھ کر آگے نکل جائے۔ اگر یہ محبتیں اللہ کے راستے میں رکاوٹ بننے لگ جائیں تو اے مومن! ان محبتوں کو ٹھوکر لگا! اور اپنے پروردگار کے راستے پر قدم بڑھاتا چلا جا!۔

جب کوئی بندہ اللہ رب العزت سے شدید محبت کرتا ہے تو ایسے بندے سے اللہ تعالیٰ بہت پیار کرتے ہیں......سبحان اللہ!!!......اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کے چاہنے والے بھی کیسے کیسے گزرے! ان کے واقعات پڑھ کر بڑی حیرانگی ہوتی ہے۔

محبوب کے نام کے دام لگانے والے:

سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایک مرتبہ بکریاں چراتے ہوئے جارہے تھے، کیا دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ان کے قریب سے گزرا اور گزرتے ہوئے اس نے کہا:

سُبْحٰنَ ذِی الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوْتِ سُبْحٰنَ ذِیْ الْعِزَّةِ وَالْعَظْمَةِ وَالْهَيْبَةِ وَالْقُدْرَةِ وَالْكِبْرِيَاءِ وَالْجَبَرُوْتِ

جب اس نے ایسے پیارے انداز سے اللہ رب العزت کی تعریف کی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دل مچل اٹھا اور وہیں رک گئے۔ فرمایا: اے بھائی! جو کچھ کہا ہے، ذرا ایک مرتبہ پھر کہہ دے۔ اس نے کہا: جی! اس کے بدلے میں کیا دیں گے؟ فرمایا: میرا یہ بکریوں کا آدھا ریوڑ آپ کے حوالے۔ چنانچہ اس نے پھر ایک مرتبہ کہہ دیا۔ اب بجائے جذبات ٹھنڈے ہونے کے، محبت کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ دل نے چاہا، پھر سنوں۔ چنانچہ کہا: اے بھائی! ایک مرتبہ پھر کہہ دے۔ اس نے پوچھا: جی! اب کیا دیں گے؟ فرمایا: بقیہ آدھا ریوڑ بھی آپ کے حوالے کردوں گا۔ اس نے پھر یہ الفاظ کہہ دیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے کانوں میں اور بھی زیادہ رس گھل گیا اور دل مچل اٹھا۔ اور فرمایا: اے بھائی! ایک مرتبہ یہ الفاظ پھر کہہ دے۔ اس نے کہا: اب تو آپ کے پاس دینے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں۔ فرمایا: میرا دل چاہتا ہے کہ......ہوتی رہے ثنا تیرے حسن و جمال کی......اس نے کہا: اس کے بدلے میں کیا دو گے؟ فرمایا: میرے پاس بکریاں تو نہیں، وہ تو میں آپ کے حوالے کر چکا ہوں، مگر آپ کو بکریاں چرانے والے کی ضرورت ہوگی، اے دوست! میں تیری بکریاں چرایا کروں گا، تو

ایک مرتبہ یہ الفاظ پھر کہہ دے۔اس نے کہا: اے ابراہیم خلیل اللہ! آپ کو مبارک ہو، میں تو اللہ رب العزت کا فرشتہ ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے کہ جاؤ میرے خلیل کے پاس، اس کے سامنے میرا نام لو اور دیکھو وہ میرے نام کے کیا دام لگاتا ہے۔معلوم ہوا کہ جن کو اللہ رب العزت سے محبت ہوتی ہے وہ یوں اس کے نام پر قربان ہوئے جاتے ہیں، وہ اپنی جانیں بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا:

دو تابعی تھے، ان کو ایک مرتبہ ایک عیسائی بادشاہ نے گرفتار کر لیا اور ان سے کہا کہ ہمارے دین کو قبول کر لو، ورنہ ہم آپ کو کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیں گے۔انہوں نے کہا: فَاقْضِ مَا اَنْتَ قَاضٍ ''کر لے جو تو کرنا چاہتا ہے''۔چنانچہ اس نے ان میں سے ایک کو تیل میں ڈال دیا۔جب ایک کو تیل میں ڈالا تو دوسرے کی طرف دیکھا۔ان کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے۔بادشاہ یہ سمجھا کہ یہ خوف زدہ ہو گیا ہے۔چنانچہ وہ کہنے لگا: اچھا! اگر آپ میری بات مان لیں تو میں آپ کو تیل میں نہیں ڈالوں گا۔وہ کہنے لگے: او عقل کے اندھے! کیا تو یہ سوچ رہا ہے کہ میں اس لیے رو رہا ہوں کہ تو مجھے جلتے ہوئے تیل میں ڈال دے گا۔اس نے کہا: تو اور کیا؟ کہنے لگے: نہیں، مجھے تو ایک خیال آ گیا تھا جس کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔بادشاہ نے کہا: پھر بتاؤ! کون سا خیال آیا؟ کہنے لگے: میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ تیری تو ایک ہی جان ہے، تجھے جب ایک مرتبہ تیل میں ڈالا جائے گا تو تیری جان تو نکل جائے گی، اے کاش! تیرے جسم پر جتنے بال ہیں تیری اتنی جانیں ہوتیں، تجھے اتنی مرتبہ تیل میں ڈالا جاتا اور تو اتنی جانوں کا نذرانہ رب کے حوالے کر جاتا۔یہ ہوتی ہے محبت، کہ جان دی اللہ رب العزت کے نام پر، اور پھر یہ کہا: ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جان بھی رب کے نام پر قربان کرتے ہیں اور احسان بھی اللہ تعالیٰ کا مانتے ہیں کہ اے اللہ! آپ کا یہ احسان ہے کہ آپ نے ہم سے یہ نذرانہ قبول فرمالیا ہے۔ یہ محبت کی باتیں!

محبتِ الٰہی کا ایک انوکھا انداز:

جب بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو تو وہ اعمال بھی بنا سنوار کے کرتا ہے تاکہ اللہ رب العزت کے حضور ایسا عمل پہنچے کہ پروردگار کی رضا حاصل ہو جائے۔ سیدہ عائشہ صدیقہ ﷞ ایک مرتبہ درہم و دینار کو بیٹھی دھو رہی تھیں۔ نبی علیہ السلام نے دیکھ کر فرمایا: عائشہ! تم درہم کو بیٹھی دھو رہی ہو؟ عرض کیا: اے اللہ کے محبوب ﷺ! میں نے آپ ہی کی زبانی سنا کہ جب کوئی بندہ اللہ کے راستے میں درہم و دینار دیتا ہے، کسی فقیر کو، تو وہ درہم اس فقیر کے ہاتھ میں جانے سے پہلے اللہ رب العزت کے ہاتھ میں پہنچ جاتے ہیں۔ جب میں نے یہ بات سنی، میں اس وقت سے درہم و دینار کو دھو کر پاک صاف کر کے دیتی ہوں تاکہ پاک مال میرے پروردگار کے ہاتھوں میں جائے۔

اعمال کی گفٹ پیکنگ کیسے؟

آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ جب اپنے بچے کی کہیں منگنی کریں تو وہاں اگر پھل کی ٹوکری بھی بھیجنی ہو تو اس کی گفٹ پیکنگ کروا کر بھیجتے ہیں، حالانکہ اس کے اندر پھل ہوتے ہیں، مگر اس کو بھی محبت کے اظہار کی خاطر خوب صورت بنا کے بھیجتے ہیں کہ جی یہ ان کے ہاں جائے گا تو وہ اس کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے۔ جس طرح آج دنیا

میں لوگ محبت کے اظہار کے لیے اپنے تحفے کو خوبصورت چیزوں میں لپیٹ کر بھیجتے ہیں، بالکل اسی طرح مومن بھی اللہ رب العزت کی محبت کی وجہ سے اپنے عملوں کو محبت میں لپیٹ کر اپنے اللہ کے حضور بھیج رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اپنی نمازوں کی گفٹ پیکنگ کرتے ہیں کہ میری نماز بھی اللہ کے حضور پیش ہونی ہے۔ وہ بنا سنوار کے عمل کرتے ہیں اور پھر دل میں کہتے ہیں:ـ

میری قسمت سے الٰہی! پائیں یہ رنگ قبول
پھول کچھ میں نے چنے ہیں ان کے دامن کے لیے

وہ نیک عملوں کو بنا سنوار کر بھی کر رہے ہوتے ہیں اور اللہ کی رضا کے لیے ہر وقت ڈر رہے ہوتے ہیں اور اللہ رب العزت سے ان کی قبولیت مانگتے رہتے ہیں۔

عشق والوں کی نمازیں:

پھر انسان نماز پڑھتا ہے تو اس کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ یہی فرق ہے ایک عام بندے کی نماز میں اور اولیاء اللہ کی نماز میں۔ رکعتوں کے حساب سے تو دونوں کی نماز ایک جیسی ہوتی ہے، ارکان کے حساب سے ایک جیسی، الفاظ بھی ایک جیسے، مگر اس نماز کی کیفیت میں فرق ہوتا ہے۔ جب اللہ والے نماز پڑھتے ہیں تو وہ دنیا سے کٹ چکے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ رب العزت کی محبت میں ڈوب کر نماز پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ ان کی کیسی ہوتی ہے؟

⊙ ...... حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے ایک مرتبہ حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو فرمایا...... اس وقت اٹھتی جوانی تھی، ابھی پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔ فرمانے لگے:

''اشرف علی! جب میں سجدہ کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اللہ رب العزت نے میرے رخسار کا بوسہ لے لیا ہو۔'' سبحان اللہ!

⊙ ......حضرت مولانا یحییٰ رحمۃ اللہ علیہ لمبا سجدہ کرتے تھے۔ایک مرتبہ ایک شاگرد نے پوچھ لیا: حضرت! آپ اتنا لمبا سجدہ کرتے ہیں؟ فرمایا:

''جب میں سجدہ کرتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں نے اللہ رب العزت کے قدموں میں سر رکھ دیا ہے،اب میرا سر اٹھانے کو جی نہیں چاہتا۔'' اللہ اکبر!

کاش! ہمیں بھی کوئی ایسا سجدہ نصیب ہو جاتا۔......ان کی نمازیں ایسی ہوتی ہیں۔اور ایک ہم نمازیں پڑھتے ہیں، اجر وثواب کی نیت سے۔تبھی تو کہنا پڑتا ہے نا، اشراق پڑھ لو، ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملے گا، مگر اللہ والے ثواب کی وجہ سے نہیں پڑھ رہے ہوتے وہ تو ''سواد'' کی وجہ سے پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ان کو تو مزا بھی آرہا ہوتا ہے اور بندگی بھی ہو رہی ہوتی ہے۔سمجھے!......ان کی تو کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

بندگی سے ہمیں تو مطلب ہے
ہم ثواب و عذاب کیا جانیں
کس میں کتنا ثواب ملتا ہے
عشق والے حساب کیا جانیں

عشق والوں کو کیا پتہ کہ حساب وکتاب کیا ہوتا ہے؟ وہ تو اللہ کی محبت میں سجدے کر رہے ہوتے ہیں۔

⊙ ......حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے ایک عجیب بات کہی، فرمایا کہ اگر قیامت کے دن اللہ رب العزت کی میرے اوپر مہربانی ہوگئی تو میں یوں عرض کردوں گا:

''اللہ! نہ حور چاہیے، نہ قصور چاہیے، مجھے تو آپ کے عرش کے نیچے مصلّے کی جگہ چاہیے۔''

کتنا مزا آتا ہوگا!

⊙......شیخ عبدالواحد کے ایک مرید بات کررہے تھے کہ جنت میں نماز نہیں ہوگی۔ یہ سن کر حضرت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پوچھا: حضرت! آپ رو کیوں رہے ہیں؟ فرمانے لگے: کیا جنت میں نماز نہیں ہوگی؟ اس نے کہا: حضرت! جنت میں تو نماز نہیں ہوگی۔ فرمانے لگے:

''اگر جنت میں نماز نہیں ہوگی تو جنت میں جانے کا مزا ہی کیا آئے گا؟''

اللہ والوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ ان کے عمل ایسے ہوتے ہیں۔

شب زندہ دار لوگ:

لہٰذا رات کے آخری پہر میں وہ اس محبت کو نبھانے کے لیے اپنے اللہ کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ کتنے ہی تھکے ہوئے کیوں نہ ہوں، رات کے آخری پہر میں ان کے بستر ان کو اچھال دیتے ہیں۔

﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا وَّ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ (السجدہ: ١٦)

''ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں، وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں اور جو مال ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں''

وہ رات کے اس وقت میں سو نہیں سکتے ۔

اٹھ فریدا ستیا تے جھاڑو دے مسیت
توں ستا تیرا رب جاگدا تیری ڈاہڈھے نال پریت

اس وقت بڑے سے نظریں لگی ہوتی ہیں، اس لیے اس وقت میں ان کو نیند نہیں آتی۔ وہ اس وقت میں اللہ سے راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے کہنے

والے نے کہا: ؎

مجھ کو نہ اپنا ہوش نہ دنیا کا ہوش ہے
بیٹھا ہوں مست ہو کے تمہارے جمال میں
تاروں سے پوچھ لو میری رودادِ زندگی
راتوں کو جاگتا ہوں تمہارے خیال میں

وہ لوگ شبِ زندہ دار ہوتے ہیں۔

رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَ فُرْسَانٌ بِالنَّهَار

''رات کے راہب اور دن کے مجاہد۔''

علما نے اس کی ایک وجہ یہ لکھی ہے کہ عبادت، مبتدی کے حق میں دوا کی مانند ہے اور منتہی کے حق میں غذا کی مانند ہے۔ بچوں اور عورتوں کو دیکھو۔ ان کے لیے دوا پینا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ کھانسی کا شربت پینے کے لیے بچے منہ بناتے ہیں اور کہتے ہیں، جی! پیا نہیں جاتا۔ ان کو گولیاں کھانی پڑیں تو کہتے ہیں، جی! ہم سے نہیں کھائی جاتیں۔ اور اگر ان سے کہو کہ یہ آئس کریم کھاؤ، تو وہ کہیں گے ایک اور بھی لاؤ۔ یعنی دوا کھانی مشکل اور غذا کھانی آسان۔

اگر ایک ماں سارا دن کام کر کے تھکی ہوئی ہے اور عشاء کی نماز پڑھ کے کہتی ہے: اب مجھے کوئی بھی نہ جگائے، نہ کوئی ڈسٹرب کرے، میں تو سو رہی ہوں، بہت زیادہ تھک گئی ہوں، اور وہ سو جائے۔ ابھی اسے سوئے ہوئے دس منٹ ہو گزرے ہوں کہ اتنے میں اس کا ایک جوان بیٹا جو پردیس میں گیا ہوا تھا، وہ اچانک گھر آ جائے تو جیسے ہی وہ اس کی آواز سنتی ہے، ماں اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اب اس کو پیار بھی کر رہی ہے، اس کے پاس بھی بیٹھی ہوتی ہے، باتیں کر رہی ہے، ہشاش بشاش نظر آ رہی ہے۔ اب بیٹی پوچھتی ہے: امی! آپ تو کہہ رہی تھیں کہ میں تھکی ہوئی ہوں، مجھے کوئی

نہ جگائے، اب آپ کی نیند کا کیا بنا؟ کہے گی: بیٹی! یہ میرا بیٹا آیا ہے، بس اس کی آواز سن کر میری تو نیند ہی غائب ہوگئی۔

جس طرح بیٹے سے گفتگو کر کے ماں کی نیند غائب ہو جاتی ہے اسی طرح رات کو اللہ کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر کے بندے کی نیند غائب ہو جاتی ہے، ان کو نیند نہیں ستاتی، بلکہ انہیں تو وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ یہی وجہ تھی کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ دو رکعت کی نیت باندھی، سردی کی لمبی رات تھی۔ جب سلام پھیر کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دیکھا کہ تہجد کا وقت ختم ہو کر صبح صادق کا وقت قریب ہو رہا ہے۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور دعا مانگی: اللہ! میں نے تو دو رکعت کی نیت باندھی تھی، تیری راتیں بھی کتنی چھوٹی ہیں کہ میری دو رکعت میں ہی تیری رات ختم ہوگئی۔ ان کو تو راتوں کے چھوٹے ہونے کا شکوہ ہوا کرتا تھا۔ کس لیے؟ اس لیے کہ ان کو اللہ رب العزت سے محبت تھی۔ ان کے دلوں میں اللہ رب العزت کا دھیان رہتا تھا۔ اس لیے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ ایک عجیب بات ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ فرماتے تھے:

''اے اللہ! دن اچھا نہیں لگتا مگر تیری یاد کے ساتھ اور رات اچھی نہیں لگتی مگر تجھ سے راز و نیاز کے ساتھ۔''

ہر وقت ہی رہتا ہے ملاقات کا عالم:

حضرت خواجہ مجذوب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کہیں جا رہے تھے، ان کو ایک نوجوان ملا۔ اس نے کہا: حضرت! سنائیے، کیا حال ہے؟ حضرت کی انہی دنوں پنشن ہوئی تھی، ملازمت سے چھٹی ہوئی تھی۔ حضرت نے شعر میں جواب دیا۔ فرمایا: ؎

پینشن ہو گئی ہے ، کیا بات ہے اپنی
اب دن بھی ہے اپنا اور رات بھی ہے اپنی

اب اور ہی کچھ ہے مرے دن رات کا عالم
ہر وقت ہی رہتا ہے ملاقات کا عالم

اس کو کہتے ہیں توجہ الی اللہ، انابت الی اللہ، رجوع الی اللہ۔ اس کا دوسرا نام ہے ذکراللہ۔ اور یہی کیفیت ہمیں اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر وقت ہی اللہ رب العزت کی ذات کا استحضار نصیب ہو جائے۔ پھر عبادت کا کچھ اور مزا ہوگا اور اعمال کی کیفیت کچھ اور ہوگی۔

اللہ سے اللہ کو مانگ لیجیے:

اس دور میں اللہ سے:

......مال مانگنے والے بڑے

......کاروبار مانگنے والے بڑے

......گھربار مانگنے والے بڑے

......خوبصورت بیوی مانگنے والے بڑے

......اونچے عہدے مانگنے والے بڑے

لیکن آج کے دور میں اللہ سے اللہ کو مانگنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنی دعاؤں میں اللہ رب العزت سے اللہ کو مانگا کریں۔ ہمیں اس بات کی تعلیم بھی دی گئی ہے:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْكَ

''اے اللہ! میں آپ سے آپ ہی کو چاہتا ہوں''

آپ کی محبت چاہتا ہوں، آپ کی رضا چاہتا ہوں، آپ کی لقا چاہتا ہوں۔ یہ اللہ کی محبت بھی بڑی چیز ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

یہ کیفیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ بندے کے اعمال کے اندر چاشنی آجاتی ہے۔ پھر زندگی کے اندر ایک جذبہ اور سوز پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر انسان عبادت کرتے ہوئے تھکتا نہیں، اپنے مولیٰ کو یاد اسے تھکاتی نہیں، بلکہ مولیٰ کی یاد تو اسے سکون دیتی ہے۔ اسے اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ ہمیں بھی چاہیے ہم بھی اللہ رب العزت کے ساتھ شدت کے ساتھ محبت کریں۔ ایسی محبت کہ جب اذان کی آواز سن لیں تو پھر نماز پڑھے بغیر چین نہ آئے۔ ایسی محبت ہو کہ ہم ایک نماز پڑھیں تو ہمیں دوسری نماز کا انتظار شروع ہو جائے۔

ملاقات کے لیے نفلوں کا بہانہ:

میرے دوستو! اللہ والے اللہ تعالیٰ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ پانچ نمازوں سے ان کی محبت کا جذبہ ٹھنڈا ہی نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لیے نفلوں کا بہانہ بناتے ہیں۔ چنانچہ پانچ نمازیں پڑھنے کے علاوہ وہ اشراق بھی پڑھ رہے ہوتے ہیں، چاشت کی نماز بھی پڑھتے نظر آتے ہیں، اوّابین کے نفلوں میں بھی اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو رہے ہوتے ہیں اور پھر تہجد کا وقت تو ان کا خاص وقت ہوتا ہے، وہ اس وقت میں بھی اپنی جبین نیاز اپنے پروردگار کے سامنے جھکا رہے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنا ہر وقت اللہ رب العزت کی یاد میں گزارنے میں مزا آتا ہے۔

ملنے والوں سے راہ پیدا کرنا:

اللہ تعالیٰ کی ایسی محبت کیسے پیدا ہوگی؟ محبت والوں کے پاس بیٹھ کر پیدا ہو گی۔ جو لوگ کمپیوٹر کا بزنس کرتے ہیں، اگر کوئی بندہ چند دن ان کی صحبت میں بیٹھ

جائے تو اس کا دل کمپیوٹر کا بزنس کرنے کو چاہے گا۔ اگر کپڑے کا کاروبار کرنے والوں کے پاس بیٹھ جائے تو کپڑے کا کاروبار کرنے کو دل چاہے گا۔ اسی طرح جو اللہ سے محبت کرنے والوں کے پاس اٹھتا بیٹھتا ہے اس کا دل بھی اللہ سے محبت کرنے لگ جاتا ہے۔

ہمارے حضرت مرشد عالم رحمۃ اللہ علیہ پوچھا کرتے تھے:

- کپڑا کس سے ملتا ہے؟......کپڑے والوں سے
- سبزی کس سے ملتی ہے؟......سبزی والوں سے
- برف کس سے ملتی ہے؟......برف والوں سے
- دودھ کن سے ملتا ہے؟......دودھ والوں سے

پھر پوچھتے:

- اللہ کن سے ملتا ہے؟......اللہ والوں سے

ان کی صحبت میں بیٹھنے سے اللہ ملتا ہے۔

ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

خانقاہیں......یا......عشق کی دکانیں:

ایک مرتبہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مولانا محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: مولانا! کیا تم نے کبھی عشق کی دکانیں دیکھی ہیں؟ مولانا پہلے تو سوچتے رہے۔ پھر کہنے لگے: حضرت! میں نے عشق کی دکانیں دیکھی ہیں۔ انہوں نے پوچھا کون سی؟ کہنے لگے: ایک تو شاہ آفاق رحمۃ اللہ علیہ کی۔ وہ نقشبندی سلسلہ کے بزرگ تھے۔ اور ایک شاہ غلامی علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی۔ وہ بھی نقشبندی سلسلہ کے بزرگ تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ والوں کی جگہیں عشقِ الٰہی کی دکانیں ہوتی ہیں۔ غم زدہ لوگ ان اللہ والوں کی خدمت میں آتے ہیں اور عشقِ الٰہی کی پڑیا لے کر چلے جاتے ہیں اور ان کے دلوں کو سکون مل جاتا ہے۔

کائنات کی تمام لذتوں کا کیپسول:

یہ عشق کی پڑیا بھی عجیب چیز ہے۔ اللہ کا نام کائنات کی تمام لذتوں کا کیپسول ہے۔ جیسے بندہ کیپسول کھاتا ہے تو شفا مل جاتی ہے اسی طرح اللہ کا نام لینے سے بھی بندے کو روحانی شفا مل جاتی ہے۔ بس جو بندہ یہ کھانا سمجھ گیا اس کو سب لذتیں نصیب ہو گئیں۔ ان کو اللہ تعالیٰ نام لینے میں مزا آتا ہے، کیونکہ اللہ کے نام کا اپنا مزا ہوتا ہے۔

اللہ اللہ کیسا پیارا نام ہے
عاشقوں کا مینا اور جام ہے

ان کو یوں مزا آتا ہے ؎

اللہ اللہ ایں چہ شیریں ہست نام
شیر و شکر می شود جانم تمام

جب میں اللہ اللہ کا نام لیتا ہوں تو میرے اس ''من'' میں یوں مٹھاس آجاتی ہے جیسے دودھ کے اندر چینی کے مل جانے سے دودھ میں مٹھاس آجایا کرتی ہے۔

محبتِ الٰہی کے حصول کے لیے ایک مقبول دعا:

محبت الٰہی کی اس نعمت کو اللہ کے محبوب ﷺ نے بھی اللہ سے مانگا۔ چنانچہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ نبی علیہ السلام دعا کیا کرتے تھے:

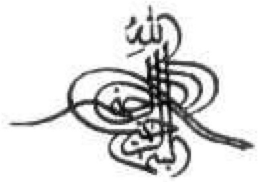
اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَ حُبَّ عَمَلٍ يُّبَلِّغُنَا اِلىٰ حُبِّكَ

''اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت کا سوال کرتا ہوں اور جو آپ سے محبت کرنے والے ہیں، میں ان سے بھی محبت کا سوال کرتا ہوں اور جو اعمال آپ کی محبت تک پہنچانے والے ہوں، میں ان کی بھی محبت کا سوال کرتا ہوں۔''

اللہ کی بھی محبت مانگی، اللہ والوں کی بھی محبت مانگی اور ایسے اعمال کی بھی محبت مانگی جو اللہ تعالیٰ کی محبت تک پہنچانے والے ہوں۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی اپنی ذات سے سچی پکی محبت کرنے والا بنا دے۔ (آمین ثم آمین)

وَ آخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ



﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ○ ﴾

حفظِ قرآن کا شوق

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

بمقام: جامعہ عائشہ جھنگ

اقتباس

اس امت میں سب سے پہلی حافظہ سیدہ عائشہ صدیقہ ؓ تھیں۔ ان کے بعد حفصہ ؓ بنت خطاب (حضرت عمر ؓ کی بہن) تھیں جو قرآن مجید کی حافظہ تھیں۔ اس طرح بچیوں میں حفظ قرآن کا سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ بہت ساری صحابیات قرآن مجید کی حافظات بھی تھیں۔ پھر یہ سلسلہ تابعین میں چلا۔ پھر تبع تابعین میں چلا۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ہزاروں بچیاں ایسی تھیں جنہوں نے حفظِ قرآن والی نعمت کو اپنے سینوں میں سمویا۔ یہ سلسلہ آج تک موجود ہے۔ اور ان شاء اللہ قیامت تک اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کے دلوں میں قرآن مجید کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ ان کے دل میں شوق اٹھتا ہے کہ میں قرآن مجید حفظ کروں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

حفظِ قرآن کا شوق

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ ○﴾ (الحجر: ۹)

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

عظمتِ قرآن:

قرآن، عظیم الشان

اللہ رب العزت کا پیغام

انسانیت کے نام

یہ کتابِ ہدایت ہے، جسے اللہ رب العزت نے انسانیت کی رہنمائی کے لیے بھیجا ہے۔ یہ دستورِ حیات ہے، منشورِ حیات ہے، ضابطہء حیات ہے، بلکہ پوری انسانیت کے لیے آبِ حیات ہے۔

قرآن مجید کو دیکھنا بھی عبادت،

پڑھنا بھی عبادت،

پڑھانا بھی عبادت،

سمجھنا بھی عبادت،

سمجھانا بھی عبادت، اور

اس پر عمل کرنا دنیا کی سب سے بڑی عبادت ہے۔

جب کسی چیز کو کسی بڑے کے ساتھ نسبت ہو تو اس چیز کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ دو اینٹیں ایک ہی بھٹے سے خرید کر لائی گئیں۔ ایک کو بیت الخلا میں لگا دیا گیا اور دوسری کو مسجد میں لگا دیا گیا۔ جو اینٹ بیت الخلا کے اندر لگی اس پر انسان ننگا پاؤں بھی رکھنا پسند نہیں کرتا اور جو اینٹ مسجد میں لگی اس پر انسان سجدہ کر کے اپنا ماتھا ٹیکتا پھرتا ہے۔ اس اینٹ کی شان کیسے بڑھی؟ کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے گھر سے نسبت ہو گئی۔ اسی طرح کتاب کو اللہ تعالیٰ سے نسبت ہے کہ وہ اللہ رب العزت کا کلام ہے اس لیے اس کی تو بہت اونچی شان ہے۔

شفاعتِ قرآن:

جس دل میں قرآن مجید کی محبت ہو گی قیامت کے دن یہ قرآن مجید اس کی شفاعت کرے گا۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ قیامت کے دن قرآن مجید کو ایک بہت ہی خوبصورت نوجوان کی شکل میں پیش کیا جائے گا اور جب کوئی قرآن مجید سے محبت کرنے والا حساب کے لیے کھڑا ہو گا تو قرآن مجید اللہ رب العزت کی بارگاہ میں عرض کرے گا: اے پروردگار عالم! یہ بندہ مجھ سے محبت کرتا تھا، اب آپ یا تو اسے معاف فرما دیجیے، ورنہ مجھے اپنے کلام سے نکال دیجیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کی شفاعت کو قبول کر کے اس بندے کو جہنم سے آزاد فرما دیں گے۔

شفاعتِ حافظِ قرآن:

قیامت کے دن ایک حافظ قرآن کو دس ایسے بندوں کی شفاعت کا حکم دیا جائے گا، جن پر جہنم واجب ہو چکی ہو گی۔ اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کن لوگوں کی شفاعت کرے گا؟ علما نے لکھا ہے کہ جب بھی کوئی بچہ یا بچی حفظِ قرآن کا

ارادہ کرتے ہیں تو ان کے قریب کے لوگوں کی دو جماعتیں بن جاتی ہیں۔

⊙ ......ایک وہ لوگ ہوتے ہیں جو ان کو منع کرتے ہیں۔ وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حافظ بن کر کیا کرو گے؟ لڑکیوں کو کہتے ہیں: تم حافظہ بن کر کیا کرو گی؟ تم بھول جاؤ گی، یاد رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس کو منع کرتے ہیں کہ یہ حافظہ نہ بنے۔ بلکہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم سکول یا کالج میں پڑھ لیتی تو اچھا ہوتا۔ ایسے لوگ اپنے قریبی رشتہ دار بھی ہو سکتے ہیں اور دوست بھی ہو سکتے ہیں۔

⊙ ......کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس بچی کی ہمت بندھاتے ہیں۔ اس کی مارل سپورٹ کرتے ہیں اور اسے کہتے ہیں کہ یہ بہت اچھا کام ہے۔ تم قرآن مجید کی حافظہ بن جاؤ گی، تمہیں اس سے اللہ تعالیٰ کا قرب ملے گا، اور نیکی کی توفیق ملے گی۔

⊙ ......محدثین نے یہ بات لکھی ہے کہ قرآن مجید کے حافظ کو جب قیامت کے دن دس بندوں کی شفاعت کی اجازت ملے گی، تو جن لوگوں نے حفظ قرآن کرنے میں اس کی مخالفت کی ہو گی وہ تمام لوگ اپنے آپ کو شفاعت کے حق سے محروم کر بیٹھیں گے۔ شفاعت کی یہ اجازت ان کے حق میں ہو گی، جو دنیا میں اس کی حوصلہ افزائی کر کے اس کی سپورٹ کرتے تھے۔ اور خوشی کا اظہار کرتے تھے، ماں باپ خوش ہو کر مدرسے میں بچے کو ڈالتے ہیں اور بہن بھائی بھی خوش ہوتے ہیں، جتنے لوگ بھی اس پر خوشی کا اظہار کریں گے ان میں سے وہ دس بندے جو جہنم میں جا چکے ہوں گے، وہ اس حافظ قرآن کی شفاعت سے اللہ تعالیٰ ان کو جہنم سے نکال کر جنت عطا فرما دیں گے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست:

قرآن مجید کا حفظ کر لینا بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ یہ سعادت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کو نصیب فرما دیتا ہے۔ وہ خوش نصیب بچیاں جنہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا ان کے والدین بھی مبارک باد کے لائق ہیں۔

ان کی معلمات بھی مبارک باد کے لائق ہیں، وہ بچیاں خود بھی مبارک باد کے لائق ہیں اوران کی جو قریبی رشتہ دار مستورات آتی ہیں وہ بھی مبارک باد کے لائق ہیں۔ یہ اللہ رب العزت کا کرم ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

''یہ سعادت زورِ بازو سے حاصل نہیں ہوتی، یہ تب ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں''

کتنے لوگ ایسے ہیں جو بڑے ذہین ہیں لیکن قرآن پاک کے حافظ نہیں بن سکتے۔ اور کتنے لوگ ایسے ہیں جو اتنے ذہین تو نہیں ہوتے مگر محنت اور اللہ تعالیٰ کی مدد سے وہ قرآن مجید کے حافظ بن جاتے ہیں۔ یہ بڑی خوش نصیبی ہے کہ انسان کا وقت اللہ تعالیٰ کے کلام کے پڑھنے میں گزرے اوراس کا ایک ایک لمحہ نیکی میں گزرے۔

مستورات میں حفظِ قرآن کا ذوق:

اس امت میں سب سے پہلی حافظہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ ان کے بعد حفصہ رضی اللہ عنہا بنت خطاب (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن) تھیں جو قرآن مجید کی حافظہ تھیں۔ اس طرح بچیوں میں حفظ قرآن کا سلسلہ چلتا رہا۔ حتیٰ کہ بہت ساری صحابیات قرآن مجید کی حافظات بھی تھیں۔ پھر یہ سلسلہ تابعین میں چلا۔ پھر تبع تابعین میں چلا۔ ہر دور اور ہر زمانے میں ہزاروں بچیاں ایسی تھیں جنہوں نے حفظِ قرآن والی نعمت کو اپنے سینوں میں سمویا۔ یہ سلسلہ آج تک موجود ہے۔ اوران شاء اللہ قیامت تک اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کے دلوں میں قرآن مجید کی محبت ڈال دیتے ہیں۔ ان کے دل میں شوق اٹھتا ہے کہ میں قرآن مجید حفظ کروں۔ لہٰذا وہ سب محنت کرتے ہیں تو وہ قرآن مجید کے حافظ بن جاتے ہیں۔

پانچ سال کی عمر میں حفظِ قرآن:

ہارون الرشید کے دربار میں ایک بچے کو پیش کیا گیا۔ اس بچے کو اس کے باپ نے کہا: بیٹا! قرآن مجید سناؤ! وہ بچہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہ اپنے والد سے جھگڑ کر کہنے لگا: ابو! آپ پہلے میرے ساتھ وعدہ کریں کہ مجھے گڑ لے کر دیں گے تا کہ میں کھا سکوں ...... چونکہ اس زمانے کہ کینڈیز اور ٹافیاں گڑ کی ڈلی ہی ہوتی تھی اس لیے اس نے اس کا مطالبہ کیا...... اس کے والد نے اسے کہا: ہاں! بیٹا! میں تجھے گڑ کی ڈلی لے کر دوں گا۔ یہ بات سن کر اس بچے نے قرآن پاک پڑھنا شروع کر دیا۔ ہارون الرشید نے اس سے پانچ جگہوں سے سنا اور اس نے پانچوں جگہ سے ٹھیک ٹھیک قرآن پاک سنا دیا۔ جب اس کی عمر پوچھی گئی تو پتہ چلا کہ اس بچے کی عمر پورے پانچ سال تھی۔ دیکھو! یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم اور کتنا احسان ہے کہ پانچ سال کا بچہ قرآن مجید کا حافظ بن گیا۔!!

نوے سال کی عمر میں حفظِ قرآن:

ہمارے ایک قریبی بزرگ ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کا حفظ مکمل کیا۔ انہوں نے تکمیل کے موقع پر اس عاجز کو حکم دیا کہ آپ نے آ کر ہمیں دستار بندی کروانی ہے۔ یہ عاجز دستار بندی کے لیے کراچی حاضر ہوا۔ جب ان کی دستار بندی ہو رہی تھی تو مجھے ان کے جسم پر ایک بال بھی کالا نظر نہیں آ رہا تھا۔ جب پتہ کیا تو ان کی عمر نوے سال کے قریب ہو چکی تھی۔

اس امت میں پانچ سال کا بچہ بھی حافظ بنا اور نوے سال کا بوڑھا بھی قرآن پاک کا حافظ بنا۔ ان دونوں کے درمیان کی عمر میں تو لاکھوں انسان حافظ بنے۔ رہ گئی بات وقت کی، تو عام طور پر بچے بچیاں دو سے تین سال کے درمیان حفظِ قرآن مکمل

کر لیتے ہیں۔ اگر ہمت سے کام لیں تو دو سال لگتے ہیں اور زیادہ محنت کریں تو ڈیڑھ سال میں، بلکہ ایک سال میں بھی حافظہ بن سکتی ہیں۔ اور کچھ ایسی بچیاں بھی ہوتی ہیں، جو ایک سال سے پہلے بھی قرآن مجید حفظ کر لیتی ہیں۔

سات مہینوں میں حفظِ قرآن:

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ہمارے جامعہ کی ایک بچی تھی۔ اس نے سات مہینے میں قرآن مجید کو مکمل یاد کیا تھا۔

سات ماہ سے کم کی بھی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً:

ایک ماہ میں حفظِ قرآن:

حضرت مولانا قاسم نانوتوی ؒ دار العلوم دیوبند کے بانی تھے۔ وہ ایک مرتبہ حج کے سفر پر تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں بحری جہازوں کے ذریعے سفر ہوتا تھا۔ اور راستے میں کئی کئی مہینے لگ جاتے تھے۔ چنانچہ لوگ رمضان المبارک سے پہلے ہی حج کا سفر شروع کر دیتے تھے۔ تاکہ وقت سے پہلے مکہ مکرمہ پہنچ جائیں۔ انہوں نے بھی ایسا ہی کیا۔

جب درمیان میں رمضان شریف کا مہینہ آیا تو ان کو پتہ چلا کہ میرے گروپ میں کوئی بھی قرآن مجید کا حافظ نہیں ہے۔ بڑے بڑے عالم تو تھے، وہ نماز بھی پڑھا سکتے تھے، مگر ان میں حافظ کوئی نہیں تھا جو انہیں تراویح میں پورا قرآن مجید سناتا۔ حضرت مولانا نے فرمایا کہ مجھے تو اچھا نہیں لگتا کہ علما کی اتنی بڑی جماعت ہو اور وہ آخری سورتوں سے تراویح پڑھیں۔ لہٰذا وہ روزانہ دن کے وقت ایک پارہ یاد کر لیتے اور رات کو تراویح کے اندر سنا دیتے۔ اُدھر رمضان المبارک مکمل ہوا اور ادھر ان کا قرآن مجید کا حفظ مکمل ہو گیا۔ یہ ایک مہینے میں قرآن مجید حفظ کرنے کی مثال ہے۔

تین دنوں میں حفظِ قرآن:

اس سے کم کی بھی مثالیں ملتی ہیں...... ہشام بن کلبی ایک عالم تھے۔ایک مرتبہ وہ کچھ علما کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ان علما نے آپس میں گفتگو کی کہ فلاں عالم ہے، فلاں حافظ ہے اور فلاں عالم بھی ہے حافظ بھی ہے۔ جب ان کا نام آیا تو انہوں نے کہا کہ یہ عالم تو بہت بڑے ہیں ،مگر یہ حافظ نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بس اسی وقت سے میرے دل میں ایک بات آئی۔اس کے بعد میں نے قرآن مجید منگوایا اور اس کو یاد کرنا شروع کر دیا۔فرماتے ہیں کہ تین دن مکمل ہونے تک میں نے پورے قرآن مجید کو یاد کر لیا۔لوگ ان کا ٹیسٹ لیا کرتے تھے اور وہ اس کا ٹیسٹ دے دیا کرتے تھے۔

عشقِ قرآن سے لبریز خاتون کا تعجب:

کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو قرآن مجید بہت اچھا یاد ہوتا ہے۔تین چار سال پہلے کی بات ہے، ایک خاتون نے ہمارے ساتھ حج کیا۔اس کو قرآن پاک ایسے یاد تھا جیسے لوگوں کو سورت فاتحہ یاد ہوتی ہے۔ جہاں سے قرآن مجید پڑھ دیتے، وہ وہیں سے آگے پڑھنا شروع کر دیتی۔اس کو تھوڑی سی دیر کے لیے بھی الجھن نہیں ہوتی تھی۔وہ اس بات پر حیران ہوتی تھی کہ لوگ قرآن پاک کو کیسے بھول جاتے ہیں یا ان کو اشکال لگ جاتا ہے!اس کو قرآن پاک اس طرح یاد تھا۔

حفظِ قرآن میں اتنی پختگی!!

ایک مرتبہ ہم نے اپنے حضرت کے ساتھ رمضان المبارک کے کچھ دن مری میں گزارے۔ایک مرتبہ شبینہ تھا، ہم بھی وہاں گئے۔امام صاحب نے کہا: حضرت! یہاں پر ملک کے دور و نزدیک سے مہمان آ کر رمضان شریف گزارتے ہیں۔ وہاں

پتہ چلا کہ اس مصلے پر چھتیس سال سے تراویح پڑھائی جارہی تھی اور ایک مرتبہ بھی کسی قاری کو کوئی متشابہ نہ لگا اور کسی کو لقمہ دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ چھتیس سال تک قرآن سنانے والے جتنے بھی قرّا آئے، ان کو اتنا قرآن پاک یاد تھا کہ کسی ایک کی بھی غلطی نہ نکلی۔ تو ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ یوں قرآن مجید یاد کروا دیتے ہیں جیسے اسکرین پر بیٹھے وہ سب کچھ دیکھ رہے ہوں۔ ایسی ان کی کیفیت ہوتی ہے۔

قرآن مجید کا کمپیوٹر:

ایک مرتبہ کراچی میں ایک تقریبِ نکاح میں ہم حاضر ہوئے۔ نکاح کے بعد ایک عالم سے ملاقات ہوئی۔ ہمارے دوستوں نے اس کا تعارف کروایا کہ جی یہ قرآن مجید کا کمپیوٹر ہے۔ یہ سن کر اول تو میں نے دل میں سوچا کہ پتا نہیں، کیوں ان کے بارے میں ایسا لفظ کہا گیا کہ یہ قرآن مجید کے کمپیوٹر ہیں۔ بس یہی کہہ دیتے کہ اچھے قاری ہیں، اچھے حافظ ہیں ...... اتنے میں دس بارہ حافظ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ وہاں پتہ چلا کہ ان کو قرآن مجید کا کمپیوٹر کیوں کہا جاتا ہے۔

ایک شخص نے ان سے سوال پوچھا: حضرت! فَتَكُونَ کا لفظ قرآن مجید میں کہاں کہاں آیا ہے؟ فَتَكُونَ کا لفظ سنتے ہی انہوں نے فوراً کہنا شروع کر دیا کہ فلاں پارہ، فلاں رکوع، اور فلاں آیت نمبر میں ایک مرتبہ ہے، دوسری جگہ پر فلاں پارہ، فلاں رکوع، اور فلاں آیت نمبر میں یہ لفظ آیا ہے۔ پھر تیسری جگہ پر بھی بالکل ٹھیک ٹھیک نشاندہی کی۔ غرض، قرآن مجید میں فَتَكُونَ کا لفظ جہاں جہاں تھا، وہ اس کی نشان دہی بھی کرتے، پارہ، رکوع اور آیت نمبر بھی بتا دیتے اور اسی وقت یہ بھی بتا دیتے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ کہاں کہاں موجود ہے۔ ان کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ ہم نے بھی ان سے بڑے مشکل سوالات پوچھے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ

جتنے الفاظ پوچھے، انہوں نے ان سب الفاظ کا بالکل صحیح صحیح جواب دے دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا فضل ہے کہ فقط قرآن مجید یاد ہی نہیں ہوتا بلکہ قرآن پاک کی اس آیت میں کون سا لفظ ہے، حافظ کو یہ بھی یاد رہ جاتا ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ

(الحدید: ۲۱)

چند ماہ کی عمر میں سورت ملک حفظ کرنے والا بچہ:

ہماری ایک شاگردہ تھی۔ اس کی شادی ہوئی۔ اللہ نے اس کو بیٹا دیا۔ اس کے خاوند قاری صاحب تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے بیٹے کو لے کر آئے۔ کہنے لگے: حضرت! ہم نے اس کے لیے دعا بھی کروانی ہے اور اس بچے نے آپ کو اپنا سبق بھی سنانا ہے۔ دیکھنے میں وہ بچہ کافی کمزور اور چھوٹا سا لگ رہا تھا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ بچہ کلمہ پڑھے گا یا پھر کوئی چھوٹی سی سورت پڑھے گا۔ یہی اس کا سبق ہوگا۔ لیکن جب میں نے اس سے کہا: پڑھو! تو اس کے والد صاحب نے کہا کہ اس کی امی نے کہا ہے کہ حضرت صاحب کو کھڑے ہو کر سنانا ہے۔ ہم نے کہا: ٹھیک ہے اس کو کھڑا کر دیں۔ وہ بچہ اتنا چھوٹا تھا کہ وہ اپنے دونوں پاؤں پر خود کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ اس بچے کی عمر کتنی چھوٹی تھی کہ جو بچہ اپنی چاہت اور شوق سے کھڑا بھی نہیں ہو سکتا، اس قدر وہ چھوٹا بچہ تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اس کو بٹھائیں تاکہ یہ سبق سنائے۔ انہوں نے کہا: جی اس کی امی نے کہا ہے کہ یہ کھڑا ہو کر سبق سنائے گا۔ ہم نے کیا کیا؟ دو گول تکیے منگوائے اور دیوار کے ساتھ لگا دیے اور اس بچے کو درمیان میں کھڑا کر دیا کہ چلو تم درمیان میں کھڑے ہو کر تکیے سے ٹیک لگا لو اور پھر ہمیں سبق سناؤ۔ چنانچہ اس نے تکیے سے ٹیک لگائی اور اس کے بعد اس بچے نے اپنا

سبق پڑھنا شروع کر دیا۔ اتنے چھوٹے سے بچے نے (جو اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا) تَبَارَكَ الَّذِیْ سے پڑھنا شروع کیا اور پوری کی پوری سورت ملک اس نے زبانی سنا دی۔ میں اس بچے کو دیکھ کر حیران ہو گیا کہ جو اتنا چھوٹا ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر اپنا وزن بھی نہیں اٹھا سکتا، لیکن اس بچے کو بھی اللہ تعالیٰ نے پوری سورت ملک یاد کرا دی۔

حفظ قرآن کا تعلق شوق اور لگن سے ہے۔ بعض بچیاں محنت کرتی ہیں تو جلدی حافظہ بن جاتی ہیں۔ اور جو محنت نہیں کرتیں وہ کئی کئی سال تک لٹکی رہتی ہیں۔

شوق کے پروں سے حافظِ قرآن کی پرواز:

میرا چھوٹا بیٹا سیف اللہ جب حافظ بن رہا تھا تو اس کا معمول تھا کہ ایک صفحہ روزانہ سبق لیتا تھا اور تقریباً اٹھارہ سے بیس دن کے درمیان ایک پارہ مکمل کر لیتا تھا۔ ہم بھی سمجھتے کہ یہ مناسب سپیڈ ہے، چلو پڑھنے دینا چاہیے۔ لیکن جب آخری پانچ چھ پارے رہ گئے، ان دنوں ہمارا عمرہ پر جانے کا بھی پروگرام تھا۔ اس کو ہم نے کہا کہ آپ کوشش کریں کہ کسی طرح آپ کا قرآن مجید جلد مکمل ہو جائے۔ خیر! اس نے کوشش کر کے پاؤ پاؤ سبق لینا شروع کر دیا۔ اس طرح اس نے چار دنوں کے اندر ایک پارہ حفظ کرنا شروع کر دیا۔

جب عمرے پر جانے کا وقت تھا تو اس کو کسی نے یہ کہا: دیکھو! ابھی دو چار دن باقی ہیں اور آپ کے تین پارے رہتے ہیں۔ اگر آپ یہ یاد کر لیں تو عمرے کے موقع پر ہم احرام کی حالت میں مقامِ ابراہیم کے قریب بیٹھ کر آپ کے لیے دعا کریں گے۔ اس بچے کو یہ بات سمجھ آ گئی۔ چنانچہ اس نے ان تین پاروں کو یاد کرنا شروع کر دیا۔ جب اس نے دو پارے مکمل یاد کر لیے اس دن ہمارا عمرے کا سفر تھا۔ ہم لوگ مکہ مکرمہ پہنچ

گئے۔ اب ایک دن رہتا تھا۔ کیونکہ ہم نے اگلے دن عمرہ کرنا تھا۔ تو اس نے کہا: ابو جی! میں کوشش کروں گا کہ میں مکمل کرسکوں۔ چنانچہ وہ فجر کی نماز کے بعد بیٹھا اور اس نے ایک مرتبہ ایک پاؤ سنایا، پھر تھوڑی دیر بعد دوسرا پاؤ یاد کر کے سنایا، پھر تیسری مرتبہ بھی پاؤ سنایا اور بالآخر چوتھی مرتبہ بھی آخری پاؤ سنا دیا۔ ہم نے اس کا آخری سبق مقام ابراہیم کے پاس بیٹھ کر سنا اور پھر ہم نے اس بچے کے لیے دعائیں کیں۔

اس سے پتا چلا کہ اگر بچے اپنے شوق سے حفظ کرنا شروع کر دیں تو یہ ایک دن میں ایک سپارہ تک بھی مکمل یاد کر لیتے ہیں۔ وہی بچہ جو بیس دنوں میں ایک پارہ یاد کرتا تھا، جب اس کا اپنا شوق شامل ہو گیا تو اس بچے نے ایک دن میں ایک پارہ مکمل یاد کر کے سنا دیا۔ اس لیے بچیوں کی خدمت میں گزارش ہے کہ آپ کے اندر جتنا شوق ہوگا، جتنا جذبہ ہوگا، جتنی لگن ہوگی کہ جی میں قرآن مجید کی حافظہ بن جاؤں، میں جہنم کی آگ سے بچ جاؤں، میں قیامت کے دن اپنے ماں باپ کے سروں پر تاج رکھے جانے کا سبب بن جاؤں، تو اتنا ہی اللہ تعالیٰ آپ کے لیے قرآن مجید کو یاد کرنا آسان بنا دیں گے۔ اور اگر آپ قرآن مجید کو یاد کرنے میں سستی کریں گی تو پھر یاد رکھیں کہ دیر لگتی چلی جائے گی۔

شریعت کے احکام پر کاربند رہیے:

اس سلسلے میں ماں باپ کی بھی دعائیں لینی چاہییں۔ اور خاص طور پر یہ یاد رکھیں کہ کوئی بھی کام خلافِ شرع نہیں کرنا چاہیے۔ نہ جھوٹ بولیں اور نہ ہی کوئی اور ایسا کام کریں۔ اس لیے کہ انسان جو بھی گناہ کرتا ہے وہ گناہ حفظ کے راستے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

ہم مبارکباد پیش کرتے ہیں ان بچیوں کو جنہوں نے حفظ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو

اپنی مقبول بندیوں میں شامل فرمالے اور قیامت کے دن ان کے سروں پر عزتوں کے تاج سجا دے۔ اللہ تعالیٰ ان بچیوں کو ساری زندگی یہ نسبت سنبھالنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

وَ آخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ﴾ (الزمر:۳)

اخلاصِ نیت

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

جب نیت میں اخلاص ہوتا ہے تو پھر عمل قبول بھی ہو جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اس بندے کا فیض بھی جاری فرما دیتے ہیں۔ دیکھیں! آج مدارس تو بہت بنتے ہیں، مگر سب مدارس کا فیض تو آگے نہیں چلتا۔ ہم نے دیکھا کہ محل نما عمارتیں بنی ہوتی ہیں، لیکن اجڑی اجڑی نظر آتی ہیں۔ ایک عمارت کسی نے مدرسے کی نیت سے بنائی اور آج وہاں پر انگریزی سکول چل رہا ہے۔ ہر ادارے کو قبولیت نہیں ملتی۔ کیوں؟ اخلاصِ نیت کی کمی کی وجہ سے فرق آجاتا ہے۔ اگر تو اہتمام کرنے والے کے دل کے اندر غم ہو تو ادارہ قبول ہو جاتا ہے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

اخلاصِ نیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ (الزمر:۳)
وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِى مَقَامٍ آخَر
﴿ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْن ﴾ (البينة: ۵)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

مومن کی نیت کا مقام:

نبی علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے''

ایک دوسری حدیث پاک میں فرمایا:

نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِّنْ عَمَلِهٖ

''مومن کی نیت اس کے عمل سے بھی زیادہ اچھی ہوتی ہے''

طالب علم کو یہ بات سمجھنے میں ذرا مشکل پیش آتی ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ نیت عمل سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ علما نے اس کی کئی وجوہات لکھی ہیں:

⊙......سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نیت کرنے سے مومن کو اجر ملتا ہے اور اس کی نیکی لکھی جاتی ہے۔ بھلے بعد میں اس کے عمل میں ریا نکلے، یا کسی وجہ سے اس کا عمل قبول نہ ہو۔ لیکن نیت کے کرنے سے اسی وقت اس کے نامہ اعمال میں نیکی لکھ دی جاتی ہے۔

⊙......دوسری وجہ یہ ہے کہ نیت کے اندر دوام ہوتا ہے اور عمل کے اندر دوام نہیں ہوتا۔ کوئی بھی عمل کریں، وہ محدود ہوگا، لیکن نیت کی کوئی حد نہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی یہ نیت کر سکتا ہے کہ جب تک میری زندگی ہے تہجد کی نماز پڑھوں گا۔ اگر اس کی زندگی سو سال ہو تو یہ نیت سو سال تک کی ہوگی اور اگر اس سے بھی زیادہ ہے تو اس میں نیت بھی زیادہ مدت تک محیط ہو جائے گی۔ اس دوام کی وجہ سے نیت عمل سے افضل ہو جاتی ہے۔

⊙......یہاں ایک نکتہ سمجھنے کی ضرورت ہے......انسان جو بھی اعمال کرتا ہے وہ محدود ہوتے ہیں، لیکن اس کو اس کے بدلے میں جو جنت ملے گی اس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ اسی طرح انسان جتنے بھی گناہ کرتا ہے وہ محدود ہوتے ہیں لیکن جہنم کا عذاب ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔ یعنی کافر نے کفر تو محدود عمر کے لیے کیا، مگر ہمیشہ ہمیشہ کا عذاب ملے گا۔

علما نے اس کی یہی وجہ بتائی کہ اگرچہ مومن محدود عمل کرتا ہے مگر اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ جب تک میری زندگی ہے میں اپنے پروردگار کی فرمانبرداری کروں گا، اس لیے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت میں رہے گا۔ اور کافر کی نیت یہ ہوتی ہے کہ میں نے اللہ کو نہیں ماننا، یا پھر اس کے ساتھ کسی کو شریک بنا دیا۔ اس نیت کی وجہ سے اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم کا عذاب دیا جائے گا۔

⊙......اس کی تیسری وجہ یہ ہے کہ نیت قلب کا عمل ہے۔ اس قلب کو پورے جسم میں

فضیلت کا مقام حاصل ہے کیونکہ وہاں پر انسان کو معرفت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا قلب کا عمل باقی تمام جسم کے اعضا کے عمل پر فضیلت رکھتا ہے اس لیے ہمیشہ اپنی نیتوں کو ٹٹولتے رہنا چاہیے۔ ان کی نگرانی کرتے رہنا چاہیے کہ ہم جو کام کر رہے ہیں، کیا واقعی وہ اللہ رب العزت کی رضا کے لیے کر رہے ہیں یا اس میں کوئی اور مقصد بھی ہے؟

بھلائی کی نیت پر بخشش کا فیصلہ:

نیت کی خرابی کی وجہ سے پہاڑوں جیسے بڑے عمل قیامت کے دن ''هَبَاءً مَّنثُورًا'' بنا دیے جائیں گے۔ اور وہ چھوٹے چھوٹے عمل جن کو انسان کر کے بھول جاتا ہے، نیت کے اخلاص کی وجہ سے قیامت کے دن انسان کی بخشش کا سبب بن جائیں گے۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ ایک بندہ قیامت کے دن اللہ رب العزت کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اس کے حق لینے والے بہت ہوں گے۔ جب ان کو ان کا حق دے دیا جائے گا تو اس بندے کے سارے عمل ہی ختم ہو جائیں گے۔ دیکھنے والے یہ سمجھیں گے کہ یہ بندہ اب ضرور جہنم میں جائے گا مگر پروردگارِ عالم فرمائیں گے: اس کے نامۂ اعمال کے سب اعمال اگرچہ لوگوں میں تقسیم ہو گئے لیکن یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ اس بندے کی نیت سب کے لیے ہمیشہ کے لیے، بھلائی کی ہوتی تھی۔ اس بندے کی بھلائی کی یہ نیت مجھے اتنی پسند آئی کہ اس نیت پر، میں نے اس بندے کی بخشش فرما دی۔

حیران کر دینے والا نامہء اعمال:

ایک روایت میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ایک بندہ پیش کیا جائے گا۔ اس کے

گ ۃ ہ ایسے ہی انکی زندگی تھی۔ پھر انہوں نے بتایا کہ میں اس وجہ سے

بھی اس کو نہیں ملا کرتیں۔

صدق دل کی علامت:

صدق دل کی علامت یہ ہے کہ جو انسان کے بس میں ہو وہ کر لے......ایک بندہ کہتا ہے کہ جی میں یہ چاہتا ہوں۔اب کیسے پتہ چلے کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے یا غلط......تو صدق دل کی یہ علامت لکھی گئی ہے کہ جتنا اس کے اختیار میں ہے، اگر وہ کر لے گا تو اللہ رب العزت اسے اس کا بھی اجر عطا فرما دے گا جو اس کے اختیار سے باہر ہو گا، اس لیے قیامت کے دن کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو دنیا کے اندر بڑے امیر گزرے ہوں گے، دنیا کے اندر ان کا شمار امراء میں ہوگا، مگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کو فقرا میں شمار فرمائیں گے، اور کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو دنیا میں نانِ شبینہ کو ترستے تھے، فاقوں میں زندگی گزارتے تھے، مگر قیامت کے دن قارون کے ساتھ ان کا حشر کر دیا جائے گا۔اس لیے کہ ان کے دل کی وہی نیت تھی جو قارون کے دل کی تھی۔ یہ دل کی نیت پر منحصر ہے۔

اگر ہمارے دل میں یہ نیت ہو گی کہ ہم اللہ رب العزت کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کی محبت سے اپنے دل کو لبریز کرنا چاہتے ہیں تو عین ممکن ہے کہ اسی نیت کو اللہ تعالیٰ قبول کر کے قیامت کے دن اپنے چاہنے والوں کی جماعت میں ہمیں بھی شامل فرما لے۔

مخلص بندے کی پہچان:

فقیہ ابو اللیث سمر قندی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا: حضرت ہم اخلاص کے بارے میں بہت کچھ سنتے رہتے ہیں، آپ ہمیں کوئی مثال سے کر سمجھائیں کہ مخلص کون ہوتا ہے؟

حضرت نے ان کو ایک عجیب مثال سے بات سمجھائی۔ فرمایا: کیا تم نے کبھی بکریوں کے چرواہے کو دیکھا ہے؟ عرض کیا: جی ہاں۔ پوچھا: جب وہ نماز پڑھتا ہے تو اس کے اردگرد بکریاں موجود ہوتی ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کبھی اس کے دل میں یہ خیال گزرا ہے کہ میری اس عبادت پر بکریاں میری تعریف کریں گی؟ اس نے کہا: نہیں۔ فرمانے لگے کہ یہ مخلص بندے کی نشانی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے اور اس کے دل میں ذرا بھی توقع نہیں ہوتی کہ لوگ میری تعریفیں کریں۔ جیسے کسی کو بکریوں سے تعریف کی امید نہیں اسی طرح اس کے دل میں بھی لوگوں سے تعریف کی کوئی امید نہیں ہوتی ع

جس کا عمل ہو بے غرض، اس کی جزا کچھ اور ہے

ہیرا اور موتی دیکھنے میں کتنا چھوٹا ہوتا ہے مگر قیمت کے اعتبار سے کتنا زیادہ ہوتا ہے۔ جس عمل میں بھی اخلاص ہوگا وہ ہیرے اور موتی کی طرح ہوگا۔

مخلص بندے کے عمل کی عظمت:

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا...... مکتوبات یا وعظ ونصیحت کی باتیں، قرآن وحدیث کی باتیں...... قلم ٹھیک نہیں چل رہا تھا۔ میں نے اسے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر ذرا ٹھیک کیا۔ ناخن پر سیاہی لگ گئی۔ فرماتے ہیں: کہ میں لکھتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے قضائے حاجت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ جب میں بیت الخلاء میں گیا تو ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے بیٹھنے لگا تو اچانک میری نظر اس سیاہی پر پڑی۔ یہ دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ جس سیاہی کو میں اللہ رب العزت کے کلام اور نبی علیہ السلام کے فرمان کو لکھنے میں استعمال کرتا ہوں، اگر میں اپنی ضرورت سے فارغ ہوا، اور طہارت کے لیے پانی استعمال کیا تو یہ سیاہی دھل کر اس نجاست کے اندر شامل ہو جائے گی اور

یہ چیز مجھے ادب کے خلاف محسوس ہوئی، چنانچہ میں نے اپنے تقاضے کو دبایا اور بیت الخلا سے باہر آ گیا۔ پھر ایک پاک جگہ پر میں نے اس سیاہی کو دھولیا۔ جیسے ہی میں نے پاک جگہ پر سیاہی کو دھویا اسی وقت مجھے الہام ہوا:

''احمد سرہندی! تیرے اس عمل کی وجہ سے ہم نے جہنم کی آگ کو تیرے اوپر حرام کر دیا۔''

اب دیکھنے میں یہ عمل کتنا چھوٹا ہے! مگر چونکہ اخلاص تھا اس لیے مغفرت کا سبب بن گیا۔

تین چیزیں اللہ کے لیے خاص ہیں:

تین چیزیں اللہ رب العزت کے لیے خاص ہیں:

⊙......پہلی چیز، رجوع۔ کوشش کی جائے کہ رجوع ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف رہے۔ اس کو کہتے ہیں، انابت الی اللہ......رجوع الی اللہ......مُنِیبِینَ اِلَیَّ......ثُمَّ اَنَابَ۔

⊙......دوسری چیز، احتیاج۔ کہ ضرورت کے وقت انسان ہمیشہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ خواہ کوئی بھی ضرورت ہو۔ حتیٰ کہ جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اپنے پرودگار سے مانگے۔

⊙......تیسری چیز، اعتماد۔ بھروسہ ہمیشہ اللہ رب العزت کی ذات پر رکھے۔ کوئی بھی کام کیا جائے اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسہ رکھا جائے۔

جس بندے کے یہ تین عمل ٹھیک ہو گئے اس کی زندگی شریعت وسنت کے مطابق بن جاتی ہے۔

قول وفعل کا تضاد:

آج کے دور میں تین باتوں میں قول اور فعل کا تضاد بہت عام ہو گیا ہے:-

(۱)......ہم کہتے ہیں کہ ہم اللہ رب العزت کے بندے ہیں، مگر کام آزاد لوگوں جیسے کرتے ہیں۔ زندگی ہی ایسے گزارتے ہیں جیسے ہم من مرضی کے مالک ہیں، بلکہ زبان سے کہہ بھی دیتے ہیں کہ ہم وہ کریں گے جو ہماری مرضی ہوگی۔ بھئی! جب کلمہ پڑھ لیا تو ہماری مرضی تو گئی۔ اب تو رب کی مرضی چلے گی، ہماری مرضی نہیں چلے گی۔ شریعت کے حکم کو ہی سب پر فضیلت حاصل ہے۔ دیکھیں! ایک ہوتا ہے خادم، ایک ہوتا ہے غلام اور ایک ہوتا ہے بندہ۔ خادم آزاد ہوتا ہے مگر کچھ وقت کے لیے اس کی خدمت پر مامور ہوتا ہے۔ غلام اس سے ذرا کم درجے کا ہوتا ہے، وہ خریدا ہوا ہوتا ہے۔ اور جس کو بندہ کہتے ہیں وہ غلام سے بھی کم درجے کا ہوتا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، اس کی مِلک ہیں، وہ ہمارا مالک ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو بندوں پر اختیار بہت زیادہ ہے بہ نسبت اس کے جو ایک بندے کو غلام پر ہوتا ہے۔ غلام سے کیا توقع کی جاتی ہے؟ کہ وہ اپنے آقا کی ہر بات مانے گا۔ کیا ہم بھی اپنے پروردگارِ حقیقی کی بات اس طرح مانتے ہیں؟......ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بندے ہیں لیکن کام آزاد لوگوں والے کرتے ہیں۔ ہمیں اپنی کوتاہی نظر ہی نہیں آتیں۔ باقی سب لوگوں کے اندر عیب نظر آتے ہیں۔ اسی لیے کسی عارف نے کہا:

> ''اے دوست! تم لوگوں کے عیب اس طرح نہ دیکھو کہ جیسے تم لوگوں کے آقا ہو، بلکہ اس طرح سے دیکھو کہ جیسے تم بھی کسی کے غلام ہو۔''

(۲)......ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ رب العزت ہمارا رازق (رزق دینے والا) ہے، لیکن دلوں کو اطمینان اس وقت تک نہیں آتا جب تک کہ سب کچھ اپنے پاس حاصل نہیں کر لیتے۔ زبان سے تو کہتے ہیں کہ اللہ کے وعدے سچے ہیں، مگر رزق کے معاملے میں، جب تک آنکھ سے نظر نہیں آجاتا کہ ہاں سب کچھ آگیا ہے، جیب میں موجود ہے، اس وقت تک یقین نہیں آتا۔

اس لیے جو بندہ آج دین داری کی زندگی گزارتا ہے اور وہ طالب علم بننا چاہتا ہے، تو گھر والوں کا اس سے سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے کہ پھر کھاؤ گے کہاں سے؟ ان کو یہ بات سمجھ ہی نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ رزق کیسے پہنچائیں گے؟

ایک صاحب بیرون ملک میں ملے۔ وہ کہتے تھے: میں تقلید کو نہیں مانتا۔ فلاں نہیں مانتا۔ فلاں نہیں مانتا۔ کچھ باتیں کہنے کے بعد مجھے کہنے لگے: آپ لوگوں کو اللہ اللہ کے سوا اور کوئی کام نہیں؟ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا: اللہ کے بندے اللہ کے واسطے قیامت کے دن یہی گواہی دے دینا کہ ان لوگوں کو دنیا میں اللہ اللہ کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ اللہ رب العزت ہمارے رازق ہیں مگر ہمیں اس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک ہماری جیب میں کچھ آ نہیں جاتا۔

(۳)...... اللہ رب العزت کی ملاقات کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔ اس بات کو تو ہم سب مانتے ہیں، مگر زندگی ایسے گزارتے ہیں جیسے ہمیں مرنا ہی نہیں۔ ہر بندہ کہے گا کہ جی! موت آنی ہے۔ لیکن اگر پوچھا جائے کہ اس کی تیاری کس نے کرنی ہے، تو ہم میں سے کوئی بھی ہاتھ کھڑا نہیں کر سکے گا۔ ہمیں موت کی تیاری جس طرح سے کرنی چاہیے ہم نہیں کر پا رہے۔ دنیا ہی کے معاملات میں الجھے ہوتے ہیں۔ حالانکہ دنیا انسان کے جسم کو بوڑھا کر دیتی ہے اور اس کی آرزوؤں کو جوان بنا دیتی ہے۔ جی ہاں! عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی آرزوئیں بھی جوان ہوتی چلی جاتی ہیں۔ ہم اپنے کاموں کو سمیٹتے نہیں ہیں۔ یہ تو ایسے ہی ہوا جیسے بارات والے گھر پہنچ گئے تھے اور لڑکی والے لڑکی کے کان چھیدوانے کہیں گئے ہوئے تھے۔ اسی طرح جب انسان کی روانگی کا وقت آئے گا تو اسے کھڑے پیر سب کچھ چھوڑ کر جانا پڑے گا۔

ایک اور مثال پر ذرا غور کیجیے! اگر کسی دن آپ اپنے کاموں میں بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی آ کر کہے کہ بھئی! اٹھ کر چلو، فلاں کام کے لیے فلاں شہر جانا ہے، تو آپ

کو کتنی مصیبت نظر آئے گی؟ آپ کہیں گے: بھئی! میں نے یہ کام بھی کرنا ہے، یہ کہنا ہے، وہ بتانا ہے۔ ہمیں اپنے ارد گرد سینکڑوں ایسے کام نظر آئیں گے۔ ہم کہیں گے: میرا تو فلاں کام میرے بغیر چل ہی نہیں سکتا، میرا موجود ہونا ضروری ہے۔ اس پر موت کو قیاس کریں کہ جب ملک الموت آئیں گے تو وہ اچانک لے کر چلے جائیں گے۔ پھر ہمارے پیچھے کاموں کا کیا بنے گا؟ اس موت کی تیاری ہمیں اسی زندگی میں کرنی ہے۔ اس کے لیے ہمیں کوئی علیحدہ وقت نہیں ملے گا۔

اچھے سالک کی تین علامتیں:

علما نے اچھے سالک کی تین علامتیں لکھی ہیں:

(۱)......دل سے دنیا کو ٹھکرا دینا:

پہلی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے دل سے دنیا کو ٹھکرا دیتا ہے، وہ دنیا سے نگاہیں ہٹا کر آخرت پر جما لیتا ہے، اس لیے کہ دنیا فانی ہے اور ایک نہ ایک دن ہمیں اسے چھوڑ کر جانا ہے۔ اس کا دل اس دھوکے والے گھر سے کٹ جاتا ہے۔ اور آخرت کی طرف اس کی طبیعت مائل ہو جاتی ہے۔ جب ایسی کیفیت ہوتی ہے تو پھر انسان دنیا کے پیچھے نہیں بھاگتا، بلکہ دنیا اس کے پیچھے آتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھیں! دنیا آخرت کے سائے کی مانند ہے۔ اگر ہم سائے کے پیچھے جائیں گے تو یہ سایہ کبھی نہیں ملے گا، لیکن اگر آخرت کو بنالیں گے تو دنیا خود بخود پیچھے آتی چلی جائے گی۔ انسان کو بن مانگے دنیا تو مل سکتی ہے، لیکن بن مانگے آخرت نہیں ملتی۔ اس کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔

(۲)......موت کو محبوب سمجھنا:

دوسری علامت یہ ہے کہ موت کو محبوب سمجھتا ہے۔ آج تو حالت یہ ہے کہ اگر

آپ گھر میں موت کا نام لیں تو عورتیں نام بھی سننا پسند نہیں کرتیں، جبکہ ہمارے اکابر کا یہ حال تھا کہ موت کو یاد کرنے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک انگوٹھی بنوائی اور اس پر لکھوایا:

كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا يَا عُمَر

''اے عمر! موت ہی نصیحت کافی ہے''

بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو اس بات پر متعین کیا کہ مختلف محفلوں میں ساتھ رہو اور موقع کی مناسبت سے موت کا تذکرہ چھیڑتے رہا کرو۔ کیا ہم بھی اپنی موت کو یاد کرنے کے لیے کوئی ایسا اہتمام کرتے ہیں؟ اسی وجہ سے غفلت میں پڑ جاتے ہیں۔

یہی سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہی تھے جنہوں نے رومی کو خط لکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں فرمایا تھا:

''میرے ساتھ ایک ایسی قوم ہے جو موت کا پیالہ پینا اس طرح پسند کرتی ہے جس طرح تم شراب کا پیالہ پینا پسند کرتے ہو۔''

وہ موت کے انتظار میں رہا کرتے تھے۔ ملک الموت کو دیکھ کر کہتے تھے:

''کتنا ہی اچھا مہمان آیا......! ہم تو عرصے سے تمہارے انتظار میں تھے۔''

(۳)......صلحا کا مقبول ہونا:

تیسری علامت یہ ہے کہ وہ صلحا کا مقبول ہو۔ نیک اور پارسا لوگ اس کو پسند کریں۔ آپ نے کچھ لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ علما پر ہی اعتراض کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا تصوف میں کوئی حصہ نہیں ہوتا جن کو علما سے حسنِ ظن حاصل نہ ہو۔ کچھ تو علم کے ہی مخالف ہوتے ہیں اور کہتے ہیں:

''علموں بس کریں او یار''

علم ذکر و سلوک کے راستے میں رکاوٹ نہیں بلکہ معاون ہوتا ہے۔ حسن بصری

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں اور میرا ایک اور ساتھی اکٹھے سلوک کی راہ پر چلے، لیکن اللہ تعالیٰ نے میرے لیے منزل زیادہ آسان کر دی، کیونکہ میں علم میں اپنے بھائی سے بڑھا ہوا تھا۔

سالک کو چاہیے کہ وہ سب صلحا سے عقیدت اور محبت رکھے۔اول تو وہ مراد بنے۔جیسے:

- سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نبی علیہ السلام کی مراد بنے
- جیسے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی مراد بنے ان کے شیخ ان پر اتنے خوش تھے کہ فرمایا کرتے تھے:

''اگر شریعت اجازت دیتی کہ دو بندوں کو ایک قبر میں دفن کیا جائے تو میں وصیت کر جاتا کہ امیر خسرو اور مجھے ایک ہی قبر میں دفن کر دیا جائے۔''

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے قاضی ثنا اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں بھی اسی طرح کے الفاظ کہے۔فرماتے تھے:

''اگر قیامت کے دن رب کریم نے مجھ سے پوچھا کہ تو میرے پاس کیا لایا ہے؟ تو میں ثناء اللہ کو پکڑ کر اللہ کے حضور پیش کر دوں گا۔''

سالک اوّل تو مراد بنے۔اگر مراد نہیں بن سکتا تو کم از کم مرید تو بنے۔شیخ کی ارادت تو دل میں ہو ہی سہی۔بلکہ آج کے دور میں تو ارادت بھی خالی خولی ہوتی ہے۔مرید چاہتا ہے کہ میں پیر بن کے رہوں اور پیر سے توقع کرتا ہے کہ وہ مرید بن کے رہے۔اس طرح چونکہ ارادت پختہ نہیں ہوتی اس لیے انسان بہت سارے فیوضات سے محروم رہ جاتا ہے۔

شیخ سے ارادت کا ایک سبق آموز واقعہ:

ایک بزرگ تھے، ان سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ تھے۔وقت کے

بادشاہ کو پتہ چلا تو اس نے سوچا کہ ان کے مریدین زیادہ ہوتے چلے جارہے ہیں، کہیں میرے لیے یہ خطرہ ہی ثابت نہ ہوں، چنانچہ اس نے حضرت کو اپنے پاس بلوایا۔

بادشاہ نے کہا: جی! مجھے آپ کے متعلقین کی کثرت کی وجہ سے ڈر سا محسوس ہورہا ہے کہ کہیں آپ میرے لیے خطرہ ثابت نہ ہوں۔

انہوں نے فرمایا: جناب! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ بھیڑ جمع ہے، مریدین تھوڑے ہیں۔

بادشاہ کہنے لگا: نہیں، میں نے تو سنا ہے کہ آپ کے چاہنے والے لاکھوں ہیں۔

انہوں نے فرمایا: نہیں، آپ کو رپورٹ غلط ملی ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

بادشاہ نے کہا: نہیں، ہم تو دیکھتے ہیں کہ روزانہ سینکڑوں آدمی آپ کے پاس آتے جاتے ہیں۔

انہوں نے فرمایا: جناب! ایسا نہیں ہے، میرے تو اس دنیا میں کل ڈیڑھ مرید ہیں۔

بادشاہ نے حیران ہو کر کہا: یہ لاکھوں کا مجمع ......اور آپ کہتے ہیں کہ ڈیڑھ مرید......!!!

انہوں نے کہا: جی ہاں!

بادشاہ نے کہا: میں نہیں مانتا۔

انہوں نے کہا: میں آپ کو طریقہ بتا دیتا ہوں چیک کرنے کا۔

بادشاہ نے کہا: ٹھیک ہے۔

چنانچہ انہوں نے بادشاہ کو ایک ترکیب بتائی۔ پھر بادشاہ نے ترکیب کے مطابق اعلان کروادیا کہ ان سے جتنے تعلق رکھنے والے ہیں وہ سارے کے سارے فلاں جگہ جمع ہو جائیں۔ وہاں لاکھوں کی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے۔

وہاں پر بادشاہ نے یہ اعلان کیا کہ اس شیخ سے ایک ایسی غلطی ہوئی ہے کہ جس کی

وجہ سے آج اس کو قتل کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ ہاں! اس کے بدلے میں اگر کوئی اپنی جان پیش کر سکتا ہے تو پھر ہم ان کو معافی دینے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں...... اب کون ہاتھ کھڑا کرے...... وہیں سے لوگوں نے واپس جانا شروع کر دیا۔ بس تھوڑے سے رہ گئے۔ بادشاہ نے پھر کہا: ہے کوئی؟ جو اپنے آپ کو ان کی جگہ پر پیش کرے؟

یہ سن کر ایک مرد آگے بڑھا اور اس نے کہا: جی ہاں! آپ بے شک مجھے قتل کر دیں اور میرے شیخ کو چھوڑ دیں۔

بادشاہ نے ایک خیمہ لگایا ہوا تھا اور اس خیمے کے اندر ایک بکری بھی پہنچائی ہوئی تھی۔ پھر وہ مرید جس نے کہا: آپ مجھے میرے شیخ کی جگہ پر قتل کر دیں اس کو اس خیمے میں پہنچا دیا گیا اور اس بندے کی بجائے اس بکری کو وہاں پر ذبح کر دیا گیا۔ جب بکری کا خون خیمے سے باہر نکلا تو سب لوگوں نے سمجھا کہ بندے کو تو قتل کر دیا گیا ہے۔ اب سب لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔

بادشاہ نے پھر اعلان کیا کہ ایک اور بندے کی ضرورت ہے۔ اب کوئی اور ہے جو اپنے آپ کو اپنے شیخ کی جگہ پر پیش کرے...... اب تو وہ خون بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے کون اپنے آپ کو پیش کرتا...... چنانچہ سب خاموش ہو گئے۔ جب بار بار پوچھا گیا تو ایک عورت نے کہا: جی ہاں! میں بھی اپنے شیخ کے بدلے میں اپنی جان پیش کرتی ہوں، مجھے قتل کر دو اور میرے شیخ کو چھوڑ دو۔ اس کے بعد کسی نے ہاتھ کھڑا نہ کیا۔

چنانچہ اب شیخ نے بادشاہ سے کہا: دیکھا! میں نہیں کہتا تھا کہ آپ کو لاکھوں کا مجمع نظر آتا ہے لیکن میرے مریدین ان میں سے ڈیڑھ ہی ہیں۔

بادشاہ نے کہا: ہاں: ٹھیک ہے، مرد کی گواہی پوری اور عورت کی گواہی آدھی ہوتی ہے، اس لیے آپ نے ٹھیک ہی کہا کہ مرد ایک مرید ہے اور عورت آدھی مرید۔ یوں

ڈیڑھ مرید بن گئے۔

شیخ نے کہا: نہیں نہیں!......الٹ بات ہے......مرد آدھا مرید تھا اور عورت پوری مرید تھی، جس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر اپنی جان دینے کے لیے تیار ہوگئی۔

اس واقعہ سے پتہ چلا کہ لوگ شیخ کے ساتھ ارادت کا اظہار تو کرتے ہیں، لیکن آج ہر ایک کو ارادت میں پختگی حاصل نہیں ہوتی۔ پھر اس کی وجہ سے مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

تین سچی باتیں:

تین باتیں لوہے پر لکیر ہیں۔ ان کو اپنے سینوں پر لکھ لیجیے۔ آپ ان کو ہمیشہ سچا پائیں گے۔

(۱)......جو بندہ اپنے باطن کو درست کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو سنوار دیا کرتے ہیں۔ آج لوگ یہی تو کہتے ہیں کہ جی میری یہ بھی رکاوٹ ہے اور یہ بھی رکاوٹ ہے۔ یہ رکاوٹیں اس لیے ہوتی ہیں کہ من میں خرابی ہوتی ہے۔ جو بندہ اپنے من کو صاف کر لے گا، ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ سب رکاوٹوں کو دور کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ناموافق حالات کو بھی اس کے لیے موافق بنا دیں گے۔

(۲)......جو بندہ اپنی آخرت کو سنوار لیتا ہے اللہ رب العزت اس کی دنیا کو بھی سنوار دیتے ہیں۔

(۳)......جو بندہ اپنا معاملہ اپنے پروردگار سے درست کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کا معاملہ مخلوق کے ساتھ بھی درست فرما دیتا ہے۔ آج نوجوان سوچتے ہیں، او جی! میں کیا کروں؟ چہرے پر سنت سجاؤں گا تو امی ناراض ہو جائے گی۔ ابو ناراض ہو جائیں گے۔ فلاں ناراض ہو جائے گا......نہیں......شریعت کے معاملے میں اللہ رب العزت کی رضا کو سب سے پہلے ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ

خاوند کہتا ہے: دعا کریں بیوی دین کے معاملے میں میرے ساتھ کوآپریٹ (تعاون) نہیں کرتی۔ بیوی کہتی ہے: دعا کریں، دین کے معاملے میں خاوند میرا ساتھ نہیں دیتا۔ نہیں، ایسی بات نہیں ہوتی۔ اگر یہ میاں یا بیوی اپنے تعلق کو اللہ کے ساتھ ٹھیک کرلیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اور مخلوق کے تعلق کو خود بخود ٹھیک کر دیں گے۔ چور اپنے اندر ہوتا ہے اور ہم اسے کسی اور جگہ ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں نظر آتا ہے کہ اولاد ٹھیک نہیں۔ بھئی! اولاد میں چور نہیں ہے، چور ہمارے دل کے اندر ہے۔ ہم اگر اپنے آپ کو شریعت پر سو فیصد جما لیں گے تو اللہ رب العزت ہمارے اور مخلوق کے تعلقات کو بھی درست فرما دیں گے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ ہم تو جیسے کیسے ہیں، سو ہیں، بس اولاد ٹھیک ہو جائے۔ ایسی صورت میں اولاد ٹھیک نہیں ہو گی، اس لیے کہ ہم جیسا نمونہ ان کو پیش کریں گے وہ اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے گی۔

ایک بزرگ تھے۔ ان کے پاس ایک بندہ اپنے بیٹے کو لے کر آیا اور کہنے لگا: حضرت! دعا کریں کہ میرا بیٹا ٹھیک بن جائے...... وہ معصوم سا دودھ پیتا بچہ تھا...... اس آدمی کا چہرہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ انہوں نے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر فرمایا: اچھا! ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پہلے باپ کو نیک بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

محبت دنیا کی سزا کی علامتیں:

محبتِ دنیا کی سزا بہت سخت ہوتی ہے، اس کی تین علامتیں ہیں:-

☆ پہلی علامت...... اللہ رب العزت محبتِ دنیا کی وجہ سے بندے کو ایسا غم دے دیتے ہیں، جس سے چھٹکارا ہی نہیں ملتا، اسی لیے ڈپریشن کا شکار رہتے ہیں۔ ایک پریشانی ختم نہیں ہوتی اور دوسری اوپر سے...... وہ ختم نہیں ہوتی اور تیسری اوپر

سے...... یہ پہلی سزا ہے۔

☆ **دوسری علامت**......ایسی الجھن جو ختم ہوتی ہی نہیں۔ بندہ الجھنوں کا شکار رہتا ہے۔ روز کشتیاں کرتے ہیں اپنی پریشانیوں سے، لیکن پریشانیاں دور نہیں ہوتیں۔ لوگ آکر کہتے ہیں: حضرت! میں بڑی کوشش کر رہا ہوں کہ میری پریشانیاں دور ہوں لیکن وہ ختم ہوتی ہی نہیں۔ حضرت! آپ دعا کریں......بھئی! وہ تو دعا کر رہے ہیں، ہم بھی تو اپنے من کو صاف کریں نا! ہم چاہتے ہیں کہ ہم جیسے ہیں ہمیں نہ بدلنا پڑے، اللہ تعالیٰ ہمارے حالات کو بدل دیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

☆ **تیسری علامت**......ایسا فقر جو کبھی دور نہیں ہوتا۔ دیکھنے میں انسان لاکھوں پتی ہوگا مگر اس کے قرضے بھی لاکھوں میں ہوں گے۔ یہ بڑے بڑے بزنس مین اور کارخانہ دار بنک کے کتنے مقروض ہوتے ہیں؟ یہ ان سے ہی پوچھیں۔

تعجب خیز باتیں:

جو انسان دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کی تیاری کرے گا، رب کریم اس کی دنیا کے حالات کو بھی سنوار دیں گے۔ سنوارنے سے کیا مراد؟ یہ نہیں کہ اسے بادشاہ بنا دیں گے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے حالات کو دین کے موافق بنا دیں گے۔ کتنی عجیب بات! ہے کہ مالدار آدمی اس دنیا میں اپنے گھر میں ہر سہولت مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو کیا اسے آخرت کے گھر کے لیے سہولیات کی ضرورت نہیں ہے؟ ایک بزرگ فرمایا کرتے تھے:

''مجھے تعجب ہے اس مالدار شخص پر جو دنیا کی سہولتوں کے لیے تو سب کچھ خرچ کر دیتا ہے لیکن آخرت کی سہولت کے لیے مال خرچ نہیں کرتا۔''

وہ یہ بھی فرماتے تھے:

''مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو بستر لگا کر آرام کی نیند تو سوتا ہے مگر آخری پہر

میں اللہ کے سامنے اٹھ کر فریاد نہیں کرتا۔‘‘

اور فرماتے تھے:

’’مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو مانتا ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے حضور میری پیشی ہوگی اور پھر بھی ارادے کے ساتھ گناہ کر بیٹھتا ہے۔‘‘

گناہ...... پریشانیوں کی پوٹلی:

گناہوں کے اندر پریشانیاں ہیں۔ آپ یوں سمجھیں کہ گناہ کی مثال ایک پوٹلی کی مانند ہے اور اس پوٹلی میں پریشانیاں بھری ہوئی ہیں۔ جب ہم وہ گناہ کریں گے تو اس پوٹلی میں سے وہ پریشانیاں ہمیں چمٹ جائیں گی۔

اگر کسی کو کہا جائے کہ اس پوٹلی کے اندر بچھو ہیں، ذرا اسے کھولو، تو وہ قریب بھی نہیں جائے گا۔ کہے گا: جی! میں کیسے کھولوں؟ تو بھئی! اگر ہم بچھو والی پوٹلی کو کھولنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو پریشانیوں کی پوٹلی کو کیوں کھولتے پھرتے ہیں، گناہ کا ارتکاب کرنا پریشانیوں کی پوٹلی کو کھولنے کے مترادف ہے۔ اس لیے سالک کو چاہیے کہ وہ علم اور ارادے کے ساتھ گناہ کرنا چھوڑ دے۔

یاد رکھیں! جو انسان اللہ رب العزت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا ہے، پھر اللہ رب العزت اس کی دنیا کو بھی برباد کر دیتے ہیں۔ تصوف وسلوک کا پہلا قدم بھی یہی ہے کہ انسان حتی الوسع کوشش کرے کہ اللہ رب العزت کی نافرمانی نہ ہو۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتہ بن جائے گا؟ نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ دل میں نیت یہی رکھے، ہاں! اگر کسی وقت نفس غالب آجائے اور شیطان بہکا لے اور گناہ کروا دے تو فوراً توبہ کے ساتھ پھر اس نیت کا اعادہ کرے۔ نیت ہر وقت اپنے دل میں یہی رکھے کہ میں نے اپنے رب کی نافرمانی نہیں کرنی۔

روحانیت کی تباہی:

گناہوں کی وجہ سے آج روحانی حالتیں بہت زیادہ ابتر ہو چکی ہیں۔ مثال کے طور پر:

☆...... ہمارے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے ایک بزرگ تھے مرزا مظہر جانِ جاناں، وہ بڑے ہی باخدا اور صاحبِ کشف بزرگ تھے۔ ان کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب میں لکھا کہ اس وقت مرزا صاحب جیسا صاحبِ روحانیت شخص مجھے پوری دنیا میں نظر نہیں آتا۔

مرزا مظہر جانِ جاناں نے اپنے گھر کے ساتھ ''مسجدِ بیت'' بنائی ہوئی تھی، وہ روزانہ کی نمازیں وہاں باجماعت پڑھتے تھے، البتہ جمعہ پڑھنے کے لیے وہ دہلی کی جامع مسجد میں آیا کرتے تھے۔ حضرت کے گھر سے چند سو قدم کے فاصلے پر وہ جامع مسجد تھی۔ چونکہ حضرت باہر نہیں نکلتے تھے اس لیے مریدین ملنے کے لیے اور زیارت کرنے کے لیے تڑپا کرتے تھے۔ جب حضرت جمعہ کے دن جامع مسجد میں جاتے تھے اس وقت ملنے والے ان سے مل لیتے تھے۔ مگر حضرت کیا کرتے تھے؟ وہ یہ کرتے تھے کہ جیسے ہی مسجد میں داخل ہونے لگتے تو اپنے چہرے پر رومال لے لیتے تھے۔ دیکھنے والے اور ملنے والے اور زیادہ پریشان ہوتے تھے۔

ان کا ایک خادم تھا، اس نے ایک دن پوچھ لیا: حضرت! لوگ آپ سے اتنی محبت کرتے ہیں اور آپ کا دیدار کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ کا معاملہ یہ ہے کہ آپ چھ دن تو گھر سے باہر نکلتے ہی نہیں اور اگر ساتویں دن نکلتے ہیں تو اپنا چہرہ ہی چھپا لیتے ہیں۔ انہوں نے اس خادم کو اپنے قریب بلا کر وہی رومال اس کے سر پر ڈال دیا۔ رومال کا سر پر آنا ہی تھا کہ خادم نے چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔

جب وہ ہوش میں آیا تو اس سے پوچھا: کیا بنا؟ اس نے بتایا کہ انہوں نے جیسے

ہی میرے سر پر رومال ڈالا اور میں نے لوگوں کی طرف دیکھا تو مجھے مسجد میں چند انسان نظر آئے اور باقی سب کتے، بلے اور خنزیر نظر آرہے تھے۔ان کی روحانی شکلیں جو گناہوں کے سبب تھیں، وہ ان کو نظر آئیں۔

پھر مرزا صاحب نے فرمایا: کہ دیکھو! میری یہ روحانی کیفیت ہے۔اس وجہ سے میں اپنے چہرے کو چھپا لیتا ہوں، تاکہ میری ان پر نظر ہی نہ پڑے اور مجھے کسی کے بارے میں بدگمانی بھی نہ ہو۔

☆......اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی ہے...... یہ واقعہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ خود اپنے درسِ قرآن میں سنایا کرتے تھے......فرماتے تھے: ایک مرتبہ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ مجھے ایک مجذوب ملے۔ایک اللہ والے ملے۔میں نے انہیں پہچان لیا اور ان کے قریب ہو گیا......السلام علیکم......وعلیکم السلام......انہوں نے مجھ سے پوچھا: احمد علی! انسان کہاں بستے ہیں؟ جب انہوں نے پوچھا تو میں بڑا حیران ہوا، کیونکہ ارد گرد سب لوگ تھے۔چنانچہ میں نے کہا: حضرت! یہ سب انسان ہی تو ہیں۔جب میں نے یہ کہا تو انہوں نے حیران ہو کر ان لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا: یہ سب انسان ہیں......!!!

ان کی اس بات میں کچھ تاثیر ایسی تھی کہ میری بھی ایسی کیفیت بنی کہ مجھے بھی بازار میں جانور زیادہ اور انسان تھوڑے نظر آئے۔جب میری یہ کیفیت دور ہوئی تو وہ اللہ والے جا چکے تھے۔حضرت یہ واقعہ درس قرآن میں سنا کر یہ فرمایا کرتے تھے: ؎

مالک تو سب کا ایک مالک کا کوئی ایک
ہزاروں میں نہ ملے گا لاکھوں میں تو دیکھ
شاید لاکھوں میں کوئی ایک مل جائے۔

تصوف و سلوک کا نچوڑ یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی شریعت و سنت کے مطابق

بنائیں۔ہم سر سے لے کر پاؤں تک اپنے رب کی فرمانبرداری والی زندگی کو اختیار کریں۔اپنے دل میں ہر وقت یہ تمنا رکھیں، ورنہ اپنی زندگی میں خود بھی گناہوں کا وبال دیکھنا پڑے گا۔

تین بنیادی گناہ:

تین گناہ تمام گناہوں کی بنیاد ہیں:

(۱)......سب سے پہلا گناہ تکبر ہے، یہ ماں ہے اور عجب اور خود پسندی، سب اسی تکبر کے اندر سمائی ہوئی ہیں، عرش کے اوپر اللہ رب العزت کی نافرمانی اسی گناہ کی وجہ سے ہوئی۔شیطان نے تکبر ہی تو کیا تھا۔

(۲)......دوسرا گناہ حرص ہے، یہ حرص بہت بڑی مصیبت ہے، نوجوان میں جو شہوت ہوتی ہے وہ اسی حرص ہی کی اولاد ہے، اصل بنیاد حرص ہوتی ہے۔سوچیں تو سہی کہ ایک آدمی کا نکاح ہو گیا، پاس بیوی بھی ہے، وہ نیک بھی ہے اور محبت کرنے والی بھی ہے۔اب تو اس کی گھریلو زندگی خوشی سے گزرنی چاہیے۔مگر نہیں، اب اس کی نظر کسی اور کے اوپر ہوتی ہے۔کس وجہ سے؟ حرص کی وجہ سے۔

(۳)......تیسرا گناہ حسد ہے۔یہ ایمان والوں کے خلاف جو کینہ دل میں ہوتا ہے، یہ حسد کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ان تینوں گناہوں سے ہم ہمیشہ بچنے کی کوشش کریں۔یہ بہت ہی خطرناک گناہ ہیں، کیونکہ

☆......عرش کے اوپر جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی وہ کس وجہ سے ہوئی؟ تکبر کی وجہ سے ہوئی۔

☆......جنت میں حضرت آدم علیہ السلام سے جو بھول ہوئی اس کی بنیاد کیا بنی تھی؟ اس کی بنیاد حرص تھی۔حرص اچھی بھی ہوتی ہے اور بری بھی ہوتی ہے۔ان کے

دل میں تھا کہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہنے کا موقع ملے اور اللہ رب العزت کے قرب میں رہوں۔

☆......زمین میں جو سب سے پہلا گناہ ہوا وہ حسد کی وجہ سے ہوا کہ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو قتل کر دیا۔

یہ تینوں گناہ بنیادی گناہ ہیں۔لہٰذا ان سے بچنے کے لیے انسان کو پوری پوری کوشش کرنی چاہیے۔عمر گزر جاتی ہے اور انسان گناہوں کو چھوڑنے کی بجائے گناہ کی عادت میں پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

سفید بالوں سے حیا، مگر......

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ نبی علیہ السلام کی مبارک آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں۔سیدنا عمر رضی اللہ عنہ دیکھ کر بڑے پریشان ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ابھی میرے پاس جبرئیل آئے تھے اور وہ آکر مجھے کہنے لگے: جو بندہ کلمہ پڑھ لیتا ہے اور کلمہ پڑھتے پڑھتے اس کے بال سفید ہو جاتے ہیں۔اس بوڑھے کو عذاب دیتے ہوئے اللہ رب العزت کو حیا آتی ہے۔میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو تو بوڑھے بندے کو عذاب دیتے ہوئے حیا آتی ہے مگر بوڑھے کو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے کیوں حیا نہیں آتی؟

ایک بزرگ کی نصیحت:

ایک بزرگ تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی: ''بیٹا! گناہ نہ کر، اللہ سے حیا کر، اور اگر اللہ سے حیا نہیں تو مخلوق سے حیا کر، اور اگر مخلوق سے حیا نہیں تو اپنے آپ کو جانوروں میں شمار کر۔''

تین انمول باتیں:

آج کی پہلی محفل میں آپ تین باتیں اپنے دلوں میں محفوظ کر لیجیے۔

(۱)......سلک، کامیاب تب ہوتا ہے جب اس کے دل میں گناہوں سے بچنے کے لیے اللہ کا خوف موجود ہو، جو بندہ یہ کہے کہ جی میرے دل میں اللہ کا بڑا خوف ہے اور پھر ارادے سے گناہ کا ارتکاب کرے تو سمجھ لو کہ یہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے خوف کی یہ پہچان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچ جاتا ہے۔

(۲)......آدمی دل میں اللہ رب العزت سے نیک امیدیں رکھے۔ نیک امید رکھنے کی پہچان یہ ہے کہ ایسا بندہ ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ جو کہے نا، کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے بڑی نیک امیدیں وابستہ ہیں اور نمازیں پوری نہ پڑھتا ہو تو سمجھ لو کہ اس کی امیدیں ٹھیک نہیں، بلکہ غلط ہیں۔

(۳)...... بندے کو ہر وقت اللہ رب العزت کا دھیان نصیب رہے۔ یاد رکھیں! ہر چیز کی ایک پہچان ہوتی ہے اور محبت کی پہچان دھیان ہوتا ہے۔ کسی کو بھی محبت ہو کسی سے، ہر وقت ہی اس کو اس کا دھیان رہے گا۔ وہ بندہ آپ کو سوچوں میں گم نظر آئے گا۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کا بھی یہی معاملہ ہے۔ وہ بھی ہر وقت اللہ تعالیٰ کی سوچوں میں گم ہوتے ہیں۔ وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کے خیال میں، اللہ تعالیٰ کے دھیان میں گم نظر آئیں گے۔ اسی کو ''وقوفِ قلبی'' کہتے ہیں۔ ہمارے مشائخ نے فرمایا: لیٹے، بیٹھے، چلتے، پھرتے ہر وقت اپنے دل میں ہم اپنے رب کا دھیان رکھیں۔

ایمان ضائع ہونے کے اسباب:

تین چیزیں ایمان ضائع ہونے کا سبب بنتی ہیں:۔

(۱)......جو انسان ایمان کی نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتا اس کے ایمان کے

سلب ہونے کے چانسز زیادہ ہوتے ہیں، کیونکہ جس نعمت پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ اس نعمت کو واپس لے لیں گے۔ نعمت تب ہی باقی رہتی ہے جب انسان اس نعمت پر اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے۔ اسی لیے دعائیں سکھائی جاتی ہیں۔

رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّ بِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا وَّ بِالْإِسْلَامِ دِيْنًا

چنانچہ ہم اپنے دل میں بھی یہی سوچیں کہ ہم اپنے رب سے راضی ہیں کہ وہ ہمارا پروردگار ہے، ہم نبی علیہ السلام سے راضی ہیں کہ وہ ہمارے آقا اور سردار ہیں اور ہم دین سے راضی ہیں کہ اللہ رب العزت نے ہمیں یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔

(۲)......ایمان کے سلب ہونے کے بارے میں متفکر رہیں۔ جو انسان ایمان سلب ہونے سے بے پروا ہو جاتا ہے وہ کئی مرتبہ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ بھئی! جب ایک آدمی کو کسی چیز کا دھیان ہی نہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ وہ نعمت اس سے چھن سکتی ہے۔ اس لیے کتابوں میں لکھا ہے کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کا نام زندگی بھر مسلمانوں کی فہرست میں رہتا ہے مگر موت کے وقت اس کا نام مسلمانوں کی فہرست سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ حدیث پاک میں آیا ہے کہ قرب قیامت میں ایسا وقت آئے گا کہ تو دیکھے گا کہ ایک آدمی صبح کو اٹھے گا تو ایمان والا ہو گا اور جب شام کو سونے کے لیے بستر پر جائے گا تو ایمان سے خالی ہو چکا ہو گا۔ اس کی وجہ کیا ہو گی؟ کہ اس زمانے میں شک پیدا کرنے والی باتیں عام ہو جائیں گی:

......کبھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک

......کبھی نبی علیہ السلام کے بارے میں شک

......کبھی دین کی باتوں میں شک

یہ شک بندے کے ایمان کو ضائع کر دیتا ہے۔

(۳)......دین داروں سے نفرت ہونا۔آپ نے کئی لوگوں کو دیکھا ہوگا جو کہتے ہیں:ہمیں مولوی اچھے ہی نہیں لگتے۔یا کوئی بھی باریش چہرہ ان کو اچھا نہیں لگتا۔جس بندے کو دین داروں سے نفرت ہو اس کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔

یہ تین باتیں بہت اہم ہیں۔ایک،نعمت ایمان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں۔ دوسرا،ایمان کی حفاظت کے لیے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے رہیے اور تیسرا،دین داروں سے محبت رکھیں۔

تمام آسمانی کتابوں کا نچوڑ:

ہمارے مشائخ نے بتایا کہ اگر تمام آسمانی کتابوں کا نچوڑ نکالیں تو تین باتیں بنتی ہیں۔

<u>پہلی بات</u>......انسان کے دل میں سب سے زیادہ خوف اللہ رب العزت کا ہوتا کہ وہ گناہوں سے بچ سکے۔

<u>دوسری بات</u>......بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ سے امید اس خوف سے بھی زیادہ ہو۔یعنی جتنا اللہ تعالیٰ کا خوف ہو،اللہ تعالیٰ سے امید اس سے بھی زیادہ ہو۔

<u>تیسری بات</u>......انسان اپنے بھائی کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہو۔بتائیں:

⊙......کیا ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہماری غیبت کرے؟نہیں۔پھر ہم کسی کی غیبت کیوں کرتے ہیں؟

⊙......کیا ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہمارے ساتھ جھوٹ بولے؟نہیں۔پھر ہم کیوں جھوٹ بولتے ہیں؟

⊙......کیا ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کرے؟نہیں۔پھر ہم کیوں وعدہ خلافی کرتے ہیں؟

⊙ ......کیا ہم چاہتے ہیں کہ کوئی ہماری عزت کی طرف بری نظر سے دیکھے؟ نہیں۔ تو پھر ہم کیوں کسی کی عزت کی طرف بری نظر ڈالتے ہیں۔

یہ چیزیں تب انسان کو نصیب ہوتی ہیں جب اس کی نیت کے اندر اخلاص ہو۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی نیت اچھی کر لیں۔ ہر ایک کے بارے میں ہماری نیت خیر خواہی کی ہو، کوئی برا بھی کرے تو اس کے ساتھ ہم اچھائی کا معاملہ کریں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کسی نے برا کہا۔ آپ نے اس کے جواب میں اس کے ساتھ اچھائی کا معاملہ کیا۔ دیکھنے والا بڑا حیران ہوا اور پوچھنے لگا: حضرت! اس نے آپ کے ساتھ اتنی بدتمیزی کی اور آپ اس کے ساتھ اتنے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آئے۔ فرمایا:

كُلُّ اِنَاءٍ يَتَرَشَّحُ بِمَا فِيهِ

''ہر برتن سے وہی کچھ نکلتا ہے جو کچھ برتن میں موجود ہوتا ہے۔''

اس کے اندر شر تھا، شر ہی نکلا، اور اگر ہمارے اندر اللہ نے خیر ڈالی ہے تو ہم خیر ہی کی بات کریں گے۔

سینے کو سیاہ کر دینے والا گناہ:

کوشش کریں کہ ہماری نیت ہمیشہ صاف اور اچھی ہو، کسی کے بارے میں بری نیت نہ ہو۔ یہ جو ہوتا ہے کہ فلاں کے بارے میں دل میں کینہ، فلاں کے بارے میں کینہ، یہ چیز انسان کے دل کو سیاہ کر دیتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں نے ہمارے ساتھ زیادتی کی ہے، اب اس کے بارے میں ہمارے دل میں کینہ نہ ہو تو اور کیا ہو؟ بھئی! اچھائی کرنے والے کے بارے میں دل میں کینہ تھوڑا ہوگا؟ ہوگا تو اسی کے بارے میں جو کوئی برا کرے گا۔ مومن کی عظمت اس میں ہے کہ اس کے ساتھ جو برائی کرے اس کے بارے میں بھی دل میں کینہ مت رکھے۔ اللہ کے لیے معاف کر

دے۔لیلۃ القدر میں ہر گناہ گار کی مغفرت ہو جاتی ہے،سوائے چند ایک کے،جن میں سے ایک وہ بندہ بھی ہے جس کے دل میں کینہ ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ شب قدر کے اندر بھی اس بندے کی مغفرت نہیں فرمایا کرتے۔کوئی کتنا بھی ہمارے ساتھ برا کیوں نہ کرے،زیادتی کیوں نہ کرے،ہم اس مومن کے بارے میں کینہ مت رکھیں۔اللہ کے لیے معاف کردیں۔پھراس کی برکتیں دیکھیں۔

فیض کا اجراء کیسے؟

جب نیت میں اخلاص ہوتا ہےتو پھرعمل قبول بھی ہو جاتے ہیں اوراللہ تعالیٰ اس بندے کا فیض بھی جاری فرما دیتے ہیں۔دیکھیں! آج مدارس تو بہت بنتے ہیں،مگر سب مدارس کا فیض تو آگے نہیں چلتا۔ہم نے دیکھا کہ محل نما عمارتیں بنی ہوتی ہیں،لیکن اجڑی اجڑی نظر آتی ہیں۔ایک عمارت کسی نے مدرسے کی نیت سے بنائی اور آج وہاں پر انگریزی سکول چل رہا ہے۔ ہر ادارے کو قبولیت نہیں ملتی۔ کیوں؟ اخلاصِ نیت کی کمی کی وجہ سے فرق آجاتا ہے۔اگرتو اہتمام کرنے والے کے دل کے اندرغم ہوتو ادارہ قبول ہو جاتا ہے۔ایک ہوتا ہےعربی کا ھَمّ اورایک ہوتا ہے اردو کا''ہم''۔عربی کا جو ھَمّ ہےاس کا مطلب''غم''ہوتا ہے۔اسی ھَمّ سے مہتمم کا لفظ بنا۔کہ جس کے دل میں غم ہو۔اورایک اردو کا ہم ہے،کہ جس کا مطلب''ہم ہی ہم ہیں''۔اگراردو کا''ہم''ہوتو ادارہ گیا،اوراگرعربی کا''ھَمّ''ہوگا تو ادارہ اللہ کے ہاں قبول ہوگا۔

ہمارے اکابرین علمائے دیوبند کی زندگیوں کو دیکھیں۔ایک ایک کی زندگی میں ایسا خلوص ملتا ہے کہ انسان حیران ہوتا ہے۔اسی اخلاص کی وجہ سے ان کا فیض جاری ہوا۔پوری دنیا میں آج آپ کہیں بھی چلے جائیں،آپ کو ہر جگہ ان کے روحانی فرزند بیٹھے ہوئے دین کا کام کرتے نظرآئیں گے۔

یہ علم و ہنر کا گہوارا تاریخ کا وہ شہ پارہ ہے
ہر پھول یہاں اک شعلہ ہے ہر سرو یہاں مینارہ ہے
عابد کے یقیں سے روشن ہے سادات کا سچا صاف عمل
آنکھوں نے کہاں دیکھا ہوگا اخلاص کا ایسا تاج محل
وہ اخلاص کا تاج محل تعمیر کر کے چلے گئے
کہسار یہاں دب جاتے ہیں طوفان یہاں رک جاتے ہیں
اس کاخِ فقیری کے آگے شاہوں کے محل جھک جاتے ہیں

یہ عظمت ملتی ہے اخلاص کی وجہ سے۔

ہمارے سب دوست جو دینی ادارے چلا رہے ہیں، وہ ذرا متوجہ ہوں۔ اس کو غم بنائیں۔ ''ہم'' نہ بنائیں، غم بنائیں۔ اللہ رب العزت سے تہجد میں مانگا کریں۔ نمازوں کے بعد مانگا کریں۔ جب دل میں غم ہوگا تو اللہ رب العزت کی طرف سے قبولیت ہو جائے گی۔ چنانچہ آج کی اس محفل میں:

- ......ایک تو ہم دلوں میں نیت کریں کہ ہم ہر معاملے میں اپنی نیت خالصتاً اللہ کے لیے کریں گے۔
- ......دوسری بات یہ کہ ہم اپنے دل میں کسی کے بارے میں کینہ نہیں رکھیں گے۔
- ......تیسری بات یہ کہ ہم ہمہ تن اللہ رب العزت کے دھیان میں زندگی گزاریں گے۔ وقوفِ قلبی کے ساتھ۔

چنانچہ آپ جتنا بھی وقت لے کے آئے ہیں ......تین دن یا پانچ دن...... ہر وقت باوضو رہیں اور ہر وقت اللہ کی طرف دھیان رکھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہ خیالات میں مشغول رہنا، یہ چیز مقصد کے اندر رکاوٹ پیدا کرے گی۔ یہاں رہ کر یہی سیکھنا ہے کہ ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کے دھیان میں زندگی گزاریں۔

اکابر کا اندازِ تربیت:

جب حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے علم حاصل کر لیا تو حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں کچھ وقت گزارنے کے لیے تھانہ بھون حاضر ہوئے، طالب علم تھے، جوانی کی عمر میں تھے، ان دونوں میں علمی استعداد بہت زیادہ تھی۔

خانقاہ میں پہلا دن گزارا۔ جب رات کا وقت آیا تو دونوں کو ایک کمرے میں ٹھہرنے کے لیے کہا گیا۔ وہاں انہوں نے آپس میں دینی معاملات میں بحث شروع کر دی۔ جب ان کی آوازیں کچھ بلند ہوئیں تو وہ بڑے میاں جو خانقاہ کے نگران تھے، وہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے: آپ شہزادے آ گئے ہیں، آپ کو خانقاہ کے دستور کا پتہ نہیں، یہاں ہر بندے نے اپنی عبادت کرنی ہے، ایک دوسرے سے بات کرنا ممنوع ہے، سوائے کسی خاص ضرورت کے، اور آپ تو بیٹھے بحث کر رہے ہیں، پہلا دن ہے لہٰذا آپ کو اطلاع دی جاتی ہے کہ آئندہ آپس میں باتیں مت کیجیے اور اگر کریں گے تو آپ کا بستر خانقاہ سے باہر نکال کر رکھ دیا جائے گا۔...... ہمارے اکابر نے ایسے سلوک سیکھا کہ خانقاہ میں بات چیت کرنے پر بھی پابندی تھی۔

آپ بھی اس سے اندازہ لگا لیجیے کہ آپس میں بات چیت کرنے کی کس حد تک اجازت ہے۔ اس لیے آپ جتنا وقت بھی لے کر آئے ہیں، ہر وقت یہ فکر لگی ہوئی ہو کہ اللہ کا دھیان نصیب ہو جائے۔ لیٹے، بیٹھے، چلتے، پھرتے ہر وقت دل میں اللہ تعالیٰ کا دھیان ہو۔ بات بھی کرنی ہو تو بس ضرورت کی بات کریں، ضرورت سے زیادہ بات مت کریں، خاموشی اختیار کر کے اپنے رب کی یاد میں اپنا وقت گزاریے۔ جب آپ یہ چند دن احتیاط کے ساتھ گزاریں گے تو انشاء اللہ رب کریم آپ کی مراد عطا فرما دیں گے۔ اللہ رب العزت ہماری حاضری کو قبول فرما (آمین ثم آمین)

﴿ادْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾

(حم السجدہ: ۳۴)

حسنِ اخلاق کی اہمیت

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

دینِ اسلام نے اچھے اور اعلیٰ اخلاق کو بڑا رتبہ دیا ہے۔ انسانیت نام ہی اسی کا ہے، انسان کا لفظ بعض علما کے نزدیک ''اُنس'' سے بنا ہے اور اُنس محبت کو کہتے ہیں۔ تو جس انسان میں محبت و پیار ہو، الفت ہو، سینہ کینہ سے بھرا ہوا نہ ہو، عداوتوں اور دشمنیوں سے بھرا ہوا نہ ہو، نفرتیں تقسیم نہ کرے، بلکہ محبت و پیار کی زندگی گزارے، اس انسان میں انسانیت زیادہ ہے، اور یقیناً اللہ رب العزت کے نزدیک بھی اس کی قیمت زیادہ ہے۔ ''جس طرح درخت کی قیمت اس کے پھل کے حساب سے ہوتی ہے، انسان کی قیمت اس کے اخلاق کے حساب سے ہوتی ہے۔''

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

حسن اخلاق کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ o بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ o
﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ (حم السجدہ:۳۴)
وَقَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ مَقَامٍ آخر
﴿ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (القلم:۴)
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ o وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ o
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ o
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے:

درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، جس درخت کا پھل اچھا ہو، لوگ اسے اپنے گھروں میں لگا کر خوش ہوتے ہیں۔ اس کی نگرانی کرتے ہیں، اس درخت کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیتے۔ کوئی بچہ یا جانور نقصان پہنچائے تو اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

جس درخت کا پھل کڑوا ہو، جس کے پھلوں میں کیڑے پڑے ہوں، جس میں کانٹے ہی کانٹے ہوں، لوگ اس کے قریب سے گزرنا بھی پسند نہیں کرتے، بلکہ اس پیڑ کو ہی کاٹ دیتے ہیں۔

انسان اپنے اخلاق سے پہچانا جاتا ہے:

انسان اپنے اخلاق سے پہچانا جاتا ہے۔جس انسان کے اخلاق اچھے ہوں، لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہے، اللہ کے بندوں کے لیے راحت جان بن کر رہے، لوگ اس انسان کے ساتھ رہ کر خوش ہوتے ہیں، اسے اپنے دلوں میں جگہ دیتے ہیں، اس کے ساتھ رہنے کی دل میں آرزو اور تمنا کرتے ہیں۔وہ انسان اللہ کے بندوں کے لیے رحمت بن کر زندگی گزارتا ہے۔اسی طرح جس انسان کے اخلاق اچھے نہ ہوں، لوگ اس کے پاس بیٹھنا بھی پسند نہیں کرتے۔

اسی لیے دین اسلام نے اچھے اخلاق پر بہت زور دیا ہے۔انسان وہی ہوتا ہے جس میں انسانیت ہو، جو اللہ کے بندوں کے لیے رحمت بن کر رہے، جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے، سکھ پہنچائے، دوسروں کی مصیبت میں کام آئے، دوسروں کے عیبوں کی پردہ پوشی کرے، اللہ کی مخلوق کے ساتھ اللہ رب العزت کی نسبت سے محبت کرے۔

حیوانوں سے بھی بدتر انسان:

جو انسان دوسروں کے دل دکھی کرے، جو انسان دوسروں کے لیے وبال جان بن کر رہے، وہ انسان نہیں، وہ دوسروں کے لیے مصیبت ہے۔وہ حیوان ہے بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔اللہ تعالی فرماتے ہیں:

اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ

''یہ تو جانور ہیں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔''

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ (الاعراف:۱۷۹)

''وہ غفلت میں پڑنے والے ہیں۔''

حیوانات میں مراتب:

جانور تین طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) مفید اور بے ضرر حیوان:

کچھ جانور ہیں جو اپنی تکلیف برداشت کر لیتے ہیں، مگر دوسرے جانوروں کو تکلیف نہیں دیتے۔ جیسے گائے، بھینس اور بکری وغیرہ۔ بکری کتنی ہی بھوکی کیوں نہ ہو وہ کسی دوسرے جانور کو نہیں کاٹے گی۔ وہ بھوک سے مر جائے گی، مگر دوسری بکری کو وہ ایذا نہیں دے گی۔ گائے دوسری گائے پر حملہ نہیں کرے گی۔ وہ بھوکی ہو گی مگر بھوک برداشت کر لے گی۔ یہ سب سے بہتر جانور ہیں، جو اپنی راحت کے لیے دوسرے جانوروں کو تکلیف نہیں دیتے۔ تو اپنی تکلیف برداشت کرنی، مگر دوسروں کو دکھ نہ دینا، یہ ان کی صفت ہے۔

(۲) وحشی حیوان:

جانوروں کی ایک دوسری قسم ہے۔ جب ان کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ دوسرے جانوروں کو کاٹتے ہیں اور کھا جاتے ہیں، لیکن جب پیٹ بھر جاتا ہے تو ان کو پروا نہیں ہوتی۔ جیسے شیر اور بھیڑیا وغیرہ۔ مشہور ہے کہ اگر شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہو تو اس پر چوہا بھی چڑھ کر ناچے تو وہ سویا رہتا ہے۔ تو ضرورت کے وقت وہ کاٹ کھائے گا لیکن جب ضرورت نہ ہو یعنی اس کو بھوک نہ ہو تو اس کو کوئی پروا نہیں کہ کون اس کے قریب ہے اور کون نہیں۔

(۳) موذی حیوان:

ایک جانوروں کی تیسری قسم ہے جو دوسروں کو نقصان پہنچانے کے در پے رہتی

ہے، حالانکہ اس میں ان کا اپنا فائدہ کوئی نہیں ہوتا۔ جیسے سانپ اور بچھو وغیرہ۔ جب بچھو کسی کو کاٹتا ہے تو کون سا اس کو مزہ آتا ہے؟ یا اس کو نیند اچھی آجاتی ہے؟ یا اس کی بھوک اتر جاتی ہے؟ نہیں! وہ عادتاً دوسروں کو کاٹتا ہے اور اس کا اپنا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ بچھو کی عادت ہے کہ جس چیز کے ساتھ لگے گا اس کو اپنا ڈنگ لگائے گا۔ یہ جانوروں میں سب سے بدترین قسم ہے۔

جانوروں سے بدتر انسان:

قرآن پاک میں فرمایا گیا:

﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

''وہ جانور ہیں بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں''

تو اس کا کیا مطلب ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان حیوان بن جاتا ہے تو یہ سب سے بدترین قسم کے جانوروں کی مانند بن جاتا ہے۔ یہ سانپ اور بچھو جیسا بن جاتا ہے۔ اس کا اپنا فائدہ بھی کوئی نہیں ہوتا، مگر یہ دوسرے انسانوں کا دل دکھاتا ہے۔ اللہ کے بندوں کو دکھ پہنچا رہا ہوتا ہے، ان کے راستے میں روڑے اٹکا رہا ہوتا ہے۔ اپنے سے نیچے والوں کو، اوپر والوں کو دائیں بائیں والوں کو مصیبت میں ڈالا ہوا ہوتا ہے۔

اسی لیے آپ نے کچھ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہوگا کہ میں نے اس کا دل جلایا۔ عورتیں آپس میں بات کر رہی ہوتی ہیں۔ میں نے ایسی بات کہی کہ جلتی رہی ہوگی۔ ایسے لوگ دوسروں کو دکھ پہنچاتے ہیں اور پھر اس پر خوشیاں مناتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ

''جانور ہیں، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔''

دین میں حسنِ اخلاق کی تعلیم:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں انسان بنایا۔ مرتبہ انسانیت پر فائز فرمایا، اس لیے ہمیں اچھے اخلاق کے ساتھ زندگی گزارنی ہے۔ نبی علیہ السلام کی طرف سے بھی یہی پیغام ہے کہ ہم اچھے اخلاق کے ساتھ زندگی گزاریں۔ دوسروں کے لیے نفع رسانی کا کام کریں۔ دوسروں کا فائدہ سوچیں۔ جتنا ہم دوسروں کا فائدہ سوچیں گے، اتنا اللہ تعالیٰ ہم سے بھلا کریں گے۔

دین اسلام نے اچھے اخلاق کا حکم دیا ہے۔ نبی علیہ السلام کی یہ شان بتائی کہ

﴿ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴾ (القلم: ۴)

''اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم آپ اخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر پائے گئے۔''

نبی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اخلاقِ عظیم عطا کیے تھے۔ قرآن پاک کے اس فرمان کی تفصیل کو سمجھ لیجیے، یہ فرمان اس لیے ذہن میں آیا ہے کہ یہ طلباء موجود ہیں، یہ قرآن کے حافظ بنیں گے اور دین کے عالم بنیں گے، اس لیے یہ بات شروع سے ہی ان کے ذہن میں بٹھانی چاہیے کہ:

''انسانیت کس چیز کا نام ہے۔''

علم کیا چیز ہے؟ الفاظ کے رٹ لینے کا اور زیادہ چیزوں کے جان لینے کا نام علم نہیں۔

''علم نام ہے انسان کے اچھے اخلاق اور کردار کا۔''

اگر یہ اخلاق و کردار ہم بنالیں گے تو ہم اچھے انسان بن جائیں گے۔ اور اگر نہ بنا سکے تو پھر یہ الفاظ ہمارے کام نہیں آئیں گے، لہٰذا بچوں کی اس طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ اللہ رب العزت کو اچھے اخلاق کتنے پسند ہیں۔

اخلاق کے تین درجات

اخلاق کے تین درجے اور مرتبے ہیں:

(۱) اخلاق حسنہ یا اخلاق عالیہ

(۲) اخلاقِ کریمانہ

(۳) اخلاق عظیمہ

(۱) اخلاقِ حسنہ اور اخلاقِ عالیہ:

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم فرمایا:

یا خلیل احسن خلقکم ولو مع الکفار

''اے میرے خلیل! اپنے اخلاق کو اچھا بنا لیجیے۔ اگرچہ کفار کے ساتھ ہی کیوں نہ ہوں۔''

تو اچھے اخلاق کا ہونا، ان کو اخلاقِ حسنہ کہتے ہیں۔ اخلاق کے اس پہلے مرتبے کو ''اخلاقِ عالیہ'' بھی کہتے ہیں۔ اور ان اخلاق کا حکم قومِ یہود کو کیا گیا۔ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اندر اخلاق عالیہ پیدا کریں۔

یہ اخلاقِ حسنہ یا اخلاقِ عالیہ کیا ہوتے ہیں؟ اخلاقِ عالیہ یہ ہوتے ہیں کہ زیادتی کسی کے ساتھ نہ کرو۔ ہاں! اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی کرے اور تمہیں دکھ پہنچائے اور تم بدلہ لینا چاہو، تو تم اتنا بدلہ لے سکتے ہو جتنا تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی۔ اس سے زیادہ نہیں لے سکتے۔ اس سے زیادہ جو کرے گا تو وہ ظلم ہوگا۔ یعنی دوسروں کے ساتھ عدل کا سلوک رکھے، برابری کا سلوک کرے۔

موسوی اخلاق:

اخلاق حسنہ کیا ہے؟ وہ یہ کہ آدمی دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اگر کوئی

بندہ اس کے ساتھ زیادتی کرے، تو جتنا اس نے زیادتی کی، اگر یہ چاہے تو اس سے اتنا بدلہ لے سکتا ہے۔ چنانچہ تورات میں یہی حکم دیا گیا:

﴿اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ﴾ (المائدہ:۴۵)

''جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان، زبان کے بدلے زبان۔''

تو یہ تورات کا اصول تھا۔ قوم یہود کو اللہ نے ان اخلاق کی تعلیم دی کہ تم صرف اتنا بدلہ لے سکتے ہو جتنا تم پر زیادتی ہوئی، اس سے زیادہ نہیں۔

آج کل جو لوگ کہتے ہیں کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ یہ غلط ہے۔ ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی جو Logic (منطق) ہے، یہ بتا رہی ہے کہ آج ہمارے اندر اخلاق نہیں ہیں۔ اس سے بڑی بداخلاقی کیا ہو سکتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیں...... انتقام! اور اس انتقام کی ہوس نے آج لوگوں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ حالت یہ ہوتی ہے کہ کسی کا اچھا دیکھ ہی نہیں سکتے۔ ان کے بس میں ہو تو یہ کسی کو زندہ نہ دیکھ سکیں۔ جیسے کافر نبی علیہ السلام کو:

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

''وہ چاہتے تھے کہ اپنی نگاہوں سے نبی علیہ السلام کو گرا دیں۔''

ایسے ہوتا ہے، ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کیوں؟ اخلاق نہیں ہوتے۔

(۲) اخلاقِ کریمانہ:

قوم نصاریٰ کو اللہ نے اس سے بھی بلند درجے کا خلق عطا فرمایا تھا، اس کو اخلاق کریمانہ کہتے ہیں۔ اخلاق کریمانہ کا کیا مطلب؟ اگر کوئی آپ کے ساتھ اچھا سلوک

کرتا ہے تو آپ بھی اچھا سلوک کرو۔ اگر کوئی برا سلوک کرتا ہے تو آپ اس کو معاف کر دو۔ اسی لیے عیسائی اپنی محفلوں میں مزے لے لے کر دہراتے ہیں کہ اگر کوئی تمہارے ایک رخسار پر تھپڑ مارے تو تم اللہ کے لیے معاف کر دو اور اپنا دوسرا رخسار بھی پیش کر دو۔ تو معاف کر دینے کو اخلاقِ کریمانہ کہتے ہیں۔ یہ کریموں کا کام ہوتا ہے کہ وہ معاف کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی جہالت کی بات کرتا ہے تو آپ اس کے ساتھ جواب میں جہالت کی بات نہ کریں۔

سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کھڑے تھے۔ ایک آدمی نے آ کر الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ آپ نے اس کو دعائیں دینی شروع کر دیں۔ وہ آپ کو گالی دے رہا تھا اور آپ آگے سے دعائیں دیتے جا رہے تھے۔ ایک آدمی نے دیکھا تو کہنے لگا۔ عجیب بات ہے! یہ کیا معاملہ ہوا؟ کہ وہ آپ کو گالیاں بک رہا ہے اور آپ آگے سے دعائیں دے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

كُلُّ اَنَاءٍ يَتَرَشَّحُ بِمَا فِيْهِ

''ہر برتن کے اندر سے وہی نکلتا ہے جو اس کے اندر موجود ہوتا ہے۔''

اس کے اندر جو کچھ تھا، وہ نکل رہا ہے، اور میرے اندر جو کچھ ہے وہ نکل رہا ہے۔ یعنی جس کے اندر شر ہوگا تو شر ہی باہر نکلے گا اور کسی کے اندر خیر ہوگی تو خیر ہی باہر نکلے گی۔

ہماری حالتِ زار:

آج ہماری حالت کیا ہے؟ ذرا غصہ آئے، ہماری حقیقت کھل جاتی ہے۔ پھر ہمیں یہ بھی یاد نہیں ہوتا کہ ہمارے سر پر عمامہ یا ٹوپی ہے، چہرے پر سنت سجائی ہوئی ہے۔ بس گالیاں بکنا شروع کر دیتے ہیں۔ بیوی کو گالیاں بکتے ہیں، بچوں کو گالیاں

بکتے ہیں۔ حیران ہوتے ہیں کہ اس وضع قطع کے ساتھ بھی بات کرنے کی تمیز نہیں۔ ویسے ہم دین دار بنے پھرتے ہیں، لوگوں کو دین کی دعوتیں دے رہے ہوتے ہیں، بلا رہے ہوتے ہیں۔ محفلِ ذکر میں بیٹھ کر اونچی اونچی تسبیح پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ اب اس تسبیح کا کبھی بننے کی کیا ضرورت ہے؟ اوپر سے لا الٰہ اور اندر سے کالی بلا! تو کیا فائدہ اس کا؟ اصل چیز تو یہ دیکھنی ہے کہ اخلاق ہیں یا نہیں۔ ہم نے انسانیت بھی سیکھی ہے یا نہیں سیکھی۔ تو ہم انسان بن کر جینا سیکھیں۔ اس سے اللہ رب العزت کے ہاں بھی ہمارا مرتبہ بڑھے گا اور اللہ رب العزت ہمیں دنیا اور آخرت میں عزتیں عطا فرمائیں گے۔

شریعت کا حسن:

اللہ رب العزت نے دونوں اخلاق کی اجازت دی، دونوں اصول دینِ اسلام میں قائم رکھے۔ قوم یہود والے اخلاقِ عالیہ بھی اور قوم نصاریٰ والے اخلاقِ کریمانہ بھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسلام قیامت تک کے لیے دین ہے۔ نرم طبیعت کے لوگ معاف کرنے کو پسند کرتے ہیں، تو وہ اس اصول پر عمل کرلیں۔ یعنی اخلاقِ کریمانہ کے مطابق۔ کچھ طبیعت میں بہادر اور دلیر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، وہ کسی کی زیادتی برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کو کہا کہ اچھا بھئی! تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو اتنا لو جتنا تم پر زیادتی کی گئی۔

شریعت کا حسن دیکھیے! اگر دلیر بندے کو کہتے کہ تم معاف کردو۔ وہ جواب دیتا اسلام کو سات سلام! جو ہمیں بزدلی سکھاتا ہے۔ اگر نرم طبیعت والے بندے کو کہتے کہ اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اب لازمی اس سے بدلہ لو اور جا کر اس کو تھپڑ لگا کے آؤ تو نرم طبیعت کا بندہ کہتا کہ اسلام کو سات سلام، یہ تو ہمیں جھگڑے سکھاتا

ہے۔تو یہ شریعت کا حسن ہے۔ چونکہ یہ عالمی دین تھا۔قیامت تک کے لیے دین تھا۔اس لیے پروردگار نے دونوں اصول باقی رکھے کہ جو بندہ جس حال میں ہو اپنے لیے بہتر اصول پسند کر لے۔

(۳) اخلاقِ عظیمہ:

امتِ محمدیہ کو اللہ رب العزت نے اس سے بھی ایک بلند مرتبے کا خُلق عطا فرمایا۔جس کو اخلاقِ عظیمہ کہتے ہیں۔اخلاقِ عالیہ اور اخلاقِ کریمہ سے بھی اونچا اخلاق۔اخلاقِ عظیمہ کیا ہیں؟

اخلاقِ عظیمہ یہ ہیں کہ اگر کوئی آدمی آپ کے ساتھ برا سلوک کرے،تو فقط یہی نہیں کہ آپ اس سے بدلہ نہ لیں اور آپ اس کو معاف کر دیں، بلکہ آپ الٹا اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کریں۔بھلائی والا سلوک کریں۔فرمایا:

﴿ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ﴾ (حٰم السجدہ:۳۴)

لوگ تمہارے ساتھ برائی کا معاملہ کریں تو تم الٹا ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرو۔بروں سے بھی اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔اس کو اخلاقِ عظیمہ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کی شان بیان فرمائی کہ:

﴿ وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ ﴾ (القلم:۴)

''اے محبوب! آپ اخلاق کے سب سے اعلیٰ مرتبے پر پائے گئے۔''

اخلاقِ عظیمہ کی مثال:

میدانِ احد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایک اجتہادی غلطی ہوئی تھی۔وہ سمجھے کہ ہمارے ڈیوٹی لگی ہے اس وقت تک جب تک کہ کافر بھاگ نہیں جاتے،اب وہ بھاگ گئے ہیں۔سب لوگ مالِ غنیمت اکٹھا کر رہے ہیں،تو ہم بھی ان کی مدد کریں،تو

وہ پہاڑی سے نیچے آ گئے، جس کی وجہ سے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ جو ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے، پیچھے سے آئے اور پھر مسلمانوں کے ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ بہر حال اس پر نبی علیہ السلام کی طبیعت بڑی رنجیدہ ہوئی۔ سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا بڑا رنج تھا۔ طبیعت بہت غم زدہ تھی۔ اس غمزدہ طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیا ارشاد فرمایا؟ اے محبوب! فَاعْفُ عَنْهُمْ ان سے جو اجتہادی غلطی ہو گئی ہے...... سمجھنے میں غلطی ہو گئی، ان کی نیت بری نہیں تھی، سمجھ کی غلطی تھی۔ وہ یہ سمجھے کہ جب دشمن پسپا ہو گئے، تو بس اب کام ختم ہو گیا...... تو اب آپ کیا کیجیے! ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو معاف کر دیجیے۔ اور فقط معاف ہی نہ کیجیے۔ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ ایک قدم اور آگے...... ان کو معاف بھی کر دیجیے اور پھر ان کی طرف سے استغفار بھی کیجیے کہ اللہ بھی معاف کر دے۔ اور یہی نہیں کہ صرف معاف ہی کرنا ہے......

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾

''اے میرے محبوب! ان کو اپنے مشورے میں شامل بھی فرمایئے۔''

اب بتایئے! تین قدم آگے بتائے۔ اس کو اخلاق عظیمہ کہتے ہیں۔

اخلاق عظیمہ کی تعلیم:

عام مومن کو بھی اخلاق عظیمہ کی تعلیم دی، لیکن اگر حکم دے دیتے تو پھر یہ اخلاق ہمارے اوپر فرض ہو جاتا۔ پھر Choice (اختیار) والی بات نہ رہتی۔ اس لیے فرمایا کہ ہم پسند کرتے ہیں...... کن کو؟ ایسے ایمان والوں کو جن کے اندر یہ خوبیاں ہوں:

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾

''غصے کو پی جانے والے۔''

﴿وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾

''اللہ کے بندوں کو معاف کر دینے والے۔''

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۴)

''اور اللہ نیکو کاروں کو محبت فرماتے ہیں''

یعنی تم نے غصے کو پینا ہے، ان کو معاف بھی کرنا ہے، اور پھر ان کے ساتھ احسان کا سلوک بھی کرنا ہے۔ تو تین قدم اٹھائیں گے تو اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں گے۔

یہ ہیں اخلاق عظیمہ:

چنانچہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مہمان کے ساتھ بیٹھے تھے۔ باندی کو حکم دیا کہ مہمان کے لیے کچھ لاؤ۔ گھر میں صرف شوربہ تھا۔ اس نے شوربہ گرم کیا اور پیالے میں لے کر آ رہی تھی۔ اللہ کی بندی دیکھ کہیں رہی تھی اور قدم کہیں اٹھا رہی تھی۔ جب دروازے میں داخل ہونے لگی تو پاؤں جو اٹکا اور پیالہ گر گیا اور گرم گرم شوربہ سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے جسم کے اوپر گرا۔ اب جب ابلتا ہوا سوپ جسم پر گرے تو کیا ہوتا ہے......؟ کتنا غصہ آتا ہے! سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کے چہرے کے اوپر جلال کے آثار ظاہر ہوئے، مگر وہ خادمہ بھی اس ہی گھر کی تربیت یافتہ تھی۔ اور ان کے اخلاقِ عظیمہ کو جانتی تھی۔ جیسے ہی اس نے چہرے پر غصے کے آثار دیکھے تو اس نے فوراً! قرآن کی آیت پڑھی:

﴿وَ الْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾

''غصے کو پی جانے والے''

سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے غصہ کو برداشت کر لیا۔ جب اس نے دیکھا کہ غصہ ختم ہو گیا تو پڑھنے لگی:

﴿وَ الْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾

''انسانوں کو معاف کرنے والے۔''

اس پر آپ ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ چل میں نے تیری غلطی معاف کی۔اس نے آگے پڑھا:

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

''اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔''

فرمانے لگے: چل میں نے تجھے اللہ کے راستے میں آزاد کیا۔یہ ہیں اخلاق عظیمہ۔

برے سے بھی اچھا سلوک:

بدلہ لینا تو کجا،صرف معاف ہی نہیں کرنا، بلکہ برے سے بھی اچھا سلوک کرنا ہے۔......حکم تو یہ دیا گیا کہ جو ہمارے ساتھ جتنا برا سلوک کرے ہم اس کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کریں۔ارشاد فرمایا:

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ

''جو تجھ سے توڑے،تو اس سے جوڑ۔''

وَاعْفُ عَنْ مَنْ ظَلَمَكَ

''جو تجھ پر ظلم کرے تو اسے معاف کردے۔''

وَ اَحْسِنْ اِلٰى مَنْ اَسَاءَ اِلَيْكَ

''اور تو اس کے ساتھ اچھا سلوک کر جو تیرے ساتھ برا سلوک کرے۔''

''محترم جماعت! اچھوں سے تو ساری دنیا اچھا سلوک کرتی ہے،مزہ تو یہ ہوتا ہے کہ بروں سے اچھا سلوک کیا جائے۔''

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو تب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اپنا موازنہ نہ کریں!

لیکن آج اگر ہم اپنی زندگیوں کو دیکھیں کہ ہم کن اخلاق کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں؟ تو لگے گا کہ تینوں درجوں میں سے ہمیں ایک درجہ بھی حاصل نہیں۔ سب سے اعلیٰ درجہ حاصل ہونے کی بات تو دور، جو سب سے چھوٹا درجہ ہے، وہ بھی حاصل نہیں۔ کیونکہ ہم تو ہر بندے کو کہتے ہیں کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ یہ بات تو تینوں درجوں میں سے کسی درجہ میں بھی نہیں آتی۔ ہم تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر انتقام کے عادی بن جاتے ہیں۔ دل کے اندر کینہ رکھ لیتے ہیں۔ سینہ تو کینہ سے بھرا ہوا ہوتا ہے، اور پھر سوچتے ہیں کہ عبادات میں لذت نہیں، تہجد کی توفیق حاصل نہیں، دعائیں قبول نہیں ہوتیں، دل کو سکون نہیں۔ جب دل میں کینہ ہو تو سکون کیسے آئے گا؟

کینہ پروری کا نتیجہ:

کینہ کسے کہتے ہیں؟ کینہ کہتے ہیں کہ کسی سے رنجش ہوئی اور اس کو دل میں رکھ لیا۔ اب اس کا برا چاہا، برا سوچا، برا مانگا، اس کے بارے میں بری تمنا دل میں رکھ لی۔ اس کو کینہ کہتے ہیں......! اور آج ہر دل میں کسی نہ کسی کے بارے میں کینہ موجود ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ بھائی کے دل میں بھائی کے بارے میں کینہ موجود...... بہن بھائی کے دل میں کینہ موجود۔ ایک دوسرے کے گھر کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتے، اور کہنے کو ہم سب مسلمان ہیں۔

یاد رکھیے! احادیث میں آتا ہے کہ اللہ رب العزت لیلۃ القدر میں سب گناہ گاروں کی بخشش کر دیتے ہیں مگر چند گناہوں کی بخشش اس رات بھی نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک وہ بندہ ہے جس کے دل میں مسلمانوں کے بارے میں کینہ موجود ہو۔ تو

جس کے دل میں کینہ ہو اس کی لیلۃ القدر میں بھی بخشش نہیں ہوتی۔ کیا ہم نے کبھی اس طرف سوچا کہ ہم اپنے سینے کو بے کینہ کر دیں۔ کینے کو اپنے دل سے نکال دیں۔ یہ سنت بھی ہے۔

سینہ بے کینہ کا انعام:

نبی علیہ السلام نے ایک صحابی کو آتے دیکھا تو فرمایا: یہ جنتی ہے، جنت کی بشارت تو سب کے لیے تھی لیکن by name (نام لے کر) یوں کسی کو Pin point (نشاندہی) کر کے کہنا کہ یہ جنتی ہے، بڑے اعزاز کی بات تھی۔ ایک دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ محفل میں موجود تھے۔ فرمانے لگے کہ میں نے دل میں سوچا کہ اب میں ان کے ساتھ دوستی لگاتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ یہ کون سا ایسا عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے نبی علیہ السلام نے ان کو نام لے کر جنت کی بشارت دی۔

چنانچہ انہوں نے ان سے کہا کہ بھئی! میں آپ کے ہاں تین دن کے لیے مہمان رہنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا، بہت اچھا۔ ان کے دن رات کے معمولات دیکھے۔ تین دن کے بعد کہنے لگے: بھئی! میں تو اس لیے آیا تھا کہ آپ کا کوئی عمل دیکھوں، جو دوسروں سے بڑھ کر ہو، مجھے تو کوئی ایسا عمل نظر نہیں آیا جو دوسرے صحابہ نہ کرتے ہوں۔ آپ کے اعمال بھی ویسے ہی ہیں، کوئی انوکھی چیز نظر نہیں آئی۔ مگر یہ کیا وجہ ہے کہ نبی علیہ السلام نے آپ کا نام لے کر فرمایا ہے کہ یہ جنتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ دیکھیں! میرے اندر کوئی اور عمل تو نہیں جو دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہو، مگر ایک چیز میرے اندر ضرور موجود ہے۔ انہوں نے پوچھا وہ کیا؟ کہنے لگے کہ وہ عمل یہ ہے کہ جب میں رات کو سونے لگتا ہوں، میں ہمیشہ نیت کر کے سوتا ہوں کہ جن لوگوں نے مجھے دکھ دیا، تکلیف پہنچائی اور میرے دل میں ان کے بارے میں غصہ ہو، میں نے ان

سب کو اللہ کے لیے معاف کر دیا۔ میں اپنے سینے سے کینے کو ختم کر کے سوتا ہوں۔ شاید میرا یہ عمل اللہ کو پسند آ گیا ہو اور پروردگار نے مجھے دنیا میں جنت کی بشارت دے دی۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر:

ہم بھی بیٹھ کر سوچیں کہ ہم بھی اللہ کے لیے معاف کرنا سیکھیں۔ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی کی بیوی سے غلطی ہو گئی، بڑی غلطی تھی، اگر وہ چاہتا تو طلاق دے سکتا تھا، چاہتا تو اس کو مارتا، اس کو جو مرضی سزا دیتا، حق بجانب تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اب میں اگر اس کو سزا دوں گا اور طلاق دوں گا تو یہ پریشان ہو جائے گی۔ چلو اللہ کی بندی ہے، غلطی کر بیٹھی، میں اس کو معاف کر دیتا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ کافی عرصہ گزر گیا اور وہ آدمی فوت ہو گیا۔ کسی نے دیکھا کہ جنت کی سیر کر رہا ہے۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ کہنے لگا کہ بس اللہ رب العزت کے حضور پیشی ہوئی اور پروردگار نے معاف کر دیا۔ اس نے پوچھا تیرا کون سا عمل پسند آیا؟ کہنے لگا اور تو کوئی ایسا عمل تھا نہیں۔ پروردگار نے فرمایا کہ تم نے اپنی بیوی کو میری بندی سمجھ کر معاف کر دیا...... چل! میں تجھے اپنا بندہ سمجھ کر معاف کرتا ہوں۔

کرو مہربانی تم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر

کر بھلا، ہو بھلا:

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

”جو شخص دوسروں کو جلدی معاف کرنے والا ہو گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو جلدی معاف فرما دیں گے۔“

اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

''جو آدمی دوسروں کے عذر کو جلدی قبول کرنے والا ہوگا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عذروں کو جلدی قبول فرمالیں گے۔''

کتنا آسان ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو اللہ کے لیے معاف کرتے رہیں، قیامت کے دن اللہ رب العزت ہم پر مہربانی فرمادیں گے۔

زادِراہ کی فکر:

ہمارے اسلاف کیا کرتے تھے؟

وہ آخرت کے لیے عمل جوڑ جوڑ کر رکھتے تھے۔ان کو پتہ تھا کہ اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔چنانچہ ایک بزرگ تھے، وہ بقالہ کی دوکان کرتے تھے۔ان کے پاس لوگ کھوٹے سکے لے کر آتے۔ پہلے وقتوں میں چاندی کے روپے پیسے ہوتے تھے، جب وہ زیادہ ہاتھوں میں رہتے تو اوپر سے گھس جاتے تھے، پڑھے نہیں جاسکتے تھے، ان کو کھوٹے سکے کہتے تھے۔ان بزرگوں کے پاس لوگ کھوٹے سکے لے کر آتے، وہ ان کو پہچان لیتے اور رکھ لیتے، سودا دے دیتے۔ساری زندگی ان کا یہی معمول رہا۔ جب ان کا آخری وقت آیا اور انہیں محسوس ہوا کہ بس میرے جانے کا وقت ہے، تو انہوں نے ان کھوٹے سکوں کا تھیلا سامنے رکھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور یہ دعا مانگی:

''اللہ! میں ساری زندگی تیرے بندوں سے کھوٹے پیسے قبول کرتا رہا، تو بھی میرے کھوٹے عملوں کو قبول فرمالے۔''

کیا ہم نے بھی قیامت کے دن کی تیاری اس طرح سے کی؟ ہم اگر اس طرح سے دوسروں کی غلطیاں معاف کرنا سیکھیں گے تو اس کے بدلے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمادیں گے......دل بڑا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اتنا چھوٹا دل کر

لینا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑنا شروع کر دینا، جھگڑا شروع کر دینا، ایک دوسرے کے ساتھ بد اخلاقی سے پیش آنا شروع کر دینا، یہ مومن کا شیوہ ہرگز نہیں ہوتا۔ لیکن ہم تو دوسروں کی بال برابر بھی غلطی معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے اور اللہ تعالیٰ سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارے بڑے بڑے کرتوتوں کو معاف کر دے گا۔......!

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

''جب تو رات کو سویا کرتے تو اپنے سینے سے کینے کو ختم کر دیا کر، یہ میری سنت ہے۔ اور جو میری سنت پر عمل کرے گا، وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔''

تو کیا ہم نبی علیہ السلام کی سنت پر عمل کرتے ہیں؟

کبھی ہم نے رات کو سوتے ہوئے یہ سوچا کہ ہم جن لوگوں کے بارے میں دل میں غصہ رکھتے ہیں ہم انہیں اللہ کے لیے معاف کر دیں۔ اور جب اللہ کے لیے معاف کریں گے تو اس کے بدلے میں اللہ رب العزت ہمارے گناہ معاف کر دے گا۔

مومن کامل:

ہمیں اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے اپنے اخلاق کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ جب تک ہمارے اخلاق اچھے نہیں ہوں گے اللہ کے ہاں ہماری کوئی قیمت نہیں ہوگی۔ جس انسان کے اخلاق اچھے ہوں گے، اللہ کے ہاں وہ انسان قیمتی ہوگا۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا

''ایمان والوں میں سب سے کامل مومن وہ ہے جس کے اخلاق زیادہ اچھے ہوں۔''

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ:

''ایمان لانے کے بعد مومن کو جو سب سے بڑی نعمت نصیب ہوتی ہے وہ

اچھے اخلاق ہیں۔''

انسانیت کا معیار:

دینِ اسلام نے اچھے اور اعلیٰ اخلاق کو بڑا رتبہ دیا ہے۔ انسانیت نام ہی اسی کا ہے، انسان کا لفظ بعض علماء کے نزدیک ''اُنس'' سے بنا ہے اور اُنس محبت کو کہتے ہیں۔ تو جس انسان میں محبت و پیار ہو، الفت ہو، سینہ کینہ سے بھرا ہوا نہ ہو، عداوتوں اور دشمنیوں سے بھرا ہوا نہ ہو، نفرتیں تقسیم نہ کرے، بلکہ محبت و پیار کی زندگی گزارے، اس انسان میں انسانیت زیادہ ہے، اور یقیناً اللہ رب العزت کے نزدیک بھی اس کی قیمت زیادہ ہے۔

''جس طرح درخت کی قیمت اس کے پھل کے حساب سے ہوتی ہے، انسان کی قیمت اس کے اخلاق کے حساب سے ہوتی ہے۔''

انسان کی اصل متاع، اس کا کردار ہے۔ یہ کردار دیکھنے میں بے قیمت سی چیز نظر آتی ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ اس کردار کے ذریعے انسان دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز خرید سکتا ہے۔

''دنیا تلوار کا مقابلہ کر سکتی ہے، کردار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔''

اخلاق کی تلوار:

نبی علیہ السلام نے مدینہ اخلاق کے زور پر فتح کیا۔ ایک مرتبہ ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ جی! اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے! اس عاجز نے پوچھا وہ کیسے؟

کہنے لگا چند بہادر اور جنگ جو قسم کے لوگ مسلمانوں کے پیغمبر علیہ السلام کے گرد جمع ہو گئے تھے، انہوں نے قوت بازو کے ذریعے پوری دنیا میں اسلام پھیلا دیا......

اس عاجز نے اس سے Counter Question (سوال کے جواب میں سوال) کیا

کہ بتاؤ کہ ان چند جنگ جو اور بہادر لوگوں کو کس تلوار نے نبی علیہ السلام کے گرد اکٹھا کیا تھا؟ جب یہ سوال کیا تو وہ سوچنے لگا اور کہا کہ وہ تو مسلمانوں کے نبی علیہ السلام کے اچھے اخلاق کی وجہ سے قریب ہوئے تھے۔ میں نے کہا کہ یہی اچھے اخلاق کی تلوار تھی جس نے پوری دنیا کو فتح کرلیا۔

سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

فُتِحَتِ الْمَدِيْنَةُ بِالْاِخْلَاقِ

''مدینہ اخلاق سے فتح ہوا''

''نبی علیہ السلام نے اخلاق کی تلوار کے ذریعے مدینہ فتح کیا۔''

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقِ عظیم کی جھلکیاں:

نبی علیہ السلام کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ اچھے اخلاق کے ذریعے لوگوں کے دل جیت لیتے تھے۔

دیہاتیوں کے دل کیسے جیتے:

ایک شخص دیہات سے آئے، مسلمان ہوئے، محفل میں بیٹھے۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد جب مجلس برخاست ہوئی تو ان کو پیشاب کرنے کی ضرورت تھی۔ وہ جو اٹھے اور مسجد نبوی کے ساتھ خالی جگہ پر، جو کہ مسجد ہی کا حصہ تھی، پیشاب کرنے بیٹھ گئے۔ عام طور پر باہر دیہاتوں میں لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھا تو انہوں نے اس کو منع کرنے کی کوشش کی مگر نبی علیہ السلام نے ان کو منع کر دیا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ جب وہ فارغ ہو گئے تو نبی علیہ السلام نے ان کو بلایا اور محبت کے ساتھ پاس بٹھا کر فرمایا: دیکھو! مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے۔ اللہ تعالیٰ عظیم ہیں، بڑے ہیں، اس کے گھر کو پاک رکھنا چاہیے اور گندگی سے بچانا چاہیے۔

اتنے پیارے انداز سے سمجھایا کہ اس کے خانے میں بات بیٹھ گئی۔ وہ صحابیؓ بڑے خوش ہوئے اور حیران بھی ہوئے کہ مجھ سے اتنی بڑی غلطی ہوئی لیکن انہوں نے نہ مجھے طعنہ دیا، نہ شرمندہ کیا اور نہ انہوں نے مجھے ڈانٹا بلکہ مجھے اچھے اخلاق سے بات سمجھائی۔ جب وہ جانے لگے تو نبی علیہ السلام نے ان کو کچھ کپڑے ہدیہ اور تحفہ میں دے دیے۔ جب نبی علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ پیدل جا رہے ہیں تو آپ کے پاس ایک سواری تھی، وہ سواری بھی آپ ﷺ نے اسے ہدیہ میں دے دی۔ جب انہیں کپڑے بھی مل گئے اور سواری بھی مل گئی تو وہ بڑے حیران ہوئے۔ انہوں نے کپڑے پہن لیے اور سواری پر بیٹھ گئے اور اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ جب وہ اپنی بستی میں داخل ہونے لگے تو دور سے ہی اونچی اونچی پکارنے لگے...... اے میرے چچا!...... اے میرے ماموں!...... اے فلاں، اے فلاں، لوگوں نے پوچھا کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اتنی اونچی اونچی چیخ رہا ہے۔ کہنے لگا کہ میں ایک ایسے معلم کو دیکھ کر آیا ہوں کہ میں نے تو زندگی میں کبھی ایسی شخصیت نہیں دیکھی۔ میں نے اتنی بڑی غلطی کی لیکن انہوں نے میرے ساتھ اتنا پیار کا سلوک کیا...... مجھے معاف بھی کر دیا، کپڑے بھی دیے اور سواری بھی دی۔ دیکھو! کیسے اخلاق تھے ان کے! جب بستی والوں نے یہ سنا تو کہنے لگے: اچھا! اگر اتنے اچھے اخلاق والے ہیں تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں گے۔ اس بستی سے تین سو آدمی ان کے ساتھ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب نے آ کر کلمہ پڑھ لیا۔ یوں نبی علیہ السلام نے دل جیتے تھے...... اور یوں اسلام پھیلا۔

دشمنوں کے دل کیسے جیتے:

آپ ﷺ کے اخلاقِ عظیمہ کا یہ عالم کہ آپ ہجرت فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ کا جی چاہتا تھا کہ روانگی سے پہلے میں بیت اللہ شریف کے اندر جاؤں اور اندر جا کر دو

رکعت نفل پڑھوں اور اللہ رب العزت کے سامنے دعا کروں، سجدہ ریز ہو جاؤں۔ آپ نے اس بندے کو بلایا جس کا نام عثمان تھا اور وہ بنی شیبہ میں سے تھا، اس کے پاس بیت اللہ شریف کی چابی ہوتی تھی۔ اس سے کہا کہ بھئی! ذرا بیت اللہ کا دروازہ کھول دو تا کہ میں دو رکعت پڑھ لوں۔ اس نے آگے سے کہا کہ نہیں کھولتا، وہ مسلمان نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا: بھئی! کھول دو۔ کہنے لگا کہ نہیں کھولنا۔ آپ ﷺ کے دل کی بڑی تمنا تھی لیکن اس نے پوری نہ ہونے دی۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ نہیں مان رہا، اس وقت آپ نے فرمایا: عثمان! ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ جیسے تم چابی ہاتھ میں لے کر اس وقت کھڑے ہو، ایسے میں چابی ہاتھ میں لے کر کھڑا ہوں گا۔ اور جیسے میں تم سے مانگ رہا ہوں، ایسے ہی تم میرے سامنے خالی ہاتھ کھڑے ہو گے۔ سوچو! اس وقت کیا ہو گا؟ جب آپ نے یوں فرمایا تو اس کو غصہ آ گیا، وہ آگے سے بکواس کرنے لگا کہ شیخ چلی کے خواب دیکھنا چھوڑ دیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں چابی آئے۔ اس نے بہت ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ محبوب ﷺ نے جدا ہونا تھا، مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنی تھی۔ آپ ﷺ نے بیت اللہ کو دیکھ کر فرمایا:

"مکہ! دل نہیں چاہتا کہ تجھے چھوڑ دوں، مگر تیرے شہر کے بسنے والے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے، اس لیے میں یہاں سے ہجرت کر کے جا رہا ہوں"

آپ ﷺ نے خاموشی سے ہجرت فرمائی۔ جب فتح مکہ کا وقت آیا تو نبی علیہ السلام فاتح بن کر داخل ہوئے۔ اس وقت مکہ کے لوگوں کی حالت عجیب تھی۔ سب عورتیں یہ سمجھتی تھیں کہ آج مسلمان ہم سے گن گن کر بدلہ لیں گے۔ بعض یہ سمجھتی تھیں کہ آج پورے مکہ میں کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں رہے گی...... مال محفوظ نہیں رہے گا...... جان محفوظ نہیں رہے گی۔ مسلمانوں کو ہم نے اتنا تنگ کیا تھا کہ یہ ہم سے گن

گن کر بدلہ لیں گے۔ اس لیے وہ ڈر سے گھروں میں چھپی ہوئی تھیں۔ آدھی رات کا وقت ہو گیا اور کوئی مسلمان کسی گھر میں داخل نہیں ہوا۔ اس پر عورتیں بڑی حیران ہوئیں۔ انہوں نے مردوں سے کہا جائیں پتہ کریں، مسلمان ہیں کہاں؟ یہ کوئی Planning تو نہیں کر رہے۔ جب مردوں نے آ کر دیکھا کہ مسلمان حرم کے اندر ہیں، کوئی سجدہ کر رہا ہے، کوئی بیت اللہ کا غلاف پکڑ کر رو رہا ہے، کوئی مقام ابراہیم پر سجدے میں ہے، سب اللہ رب العزت کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے حیران ہوئے۔

چنانچہ جب اگلا دن ہوا تو نبی علیہ السلام نے عثمان کو بلایا، وہ چابی لے کر آیا۔ نبی علیہ السلام نے اس سے چابی لے لی، بیت اللہ کا دروازہ کھولا، بتوں کو توڑا، صاف کر دیا اور پھر آپ ﷺ نے وہاں نماز ادا فرمائی۔ جب باہر تشریف لائے تو آپ ﷺ نے پھر بیت اللہ کو تالہ لگا دیا۔ جب آپ ﷺ نے بیت اللہ کو تالہ لگایا تو اس وقت وہاں پر عجیب منظر تھا...... کیونکہ مکہ مکرمہ والے سمجھ رہے تھے کہ وہ بڑا خوش نصیب ہو گا جس کے ہاتھ میں آج آپ چابی دیں گے۔ قریش کے لوگ بھی قریب ہو گئے، جو آپ کے خدام تھے وہ بھی قریب ہو گئے۔ ہر صحابی کے دل میں تمنا تھی کہ مجھے بیت اللہ کا چابی بردار بنا دیا جائے۔

جب کوئی فاتح بن کر داخل ہوتا ہے تو وہ دشمن کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ساری دنیا کا دستور یہی ہے، مگر یہ تو ایک نرالا فاتح تھا، جس نے ساری دنیا کو اخلاق کا درس دینا تھا۔ چنانچہ نبی علیہ السلام نے جب تالہ لگا دیا تو اس وقت عثمان آپ کے سامنے تھا۔

آپ نے فرمایا: عثمان! اس وقت کو یاد کرو، جب میں نے تم سے چابی مانگی تھی اور تم نے دینے سے انکار کیا تھا۔ دیکھو! آج چابی میرے ہاتھ میں ہے، تم خالی ہاتھ

میرے سامنے کھڑے ہو۔اس وقت وہ کہنے لگا کہ جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: جیسا تو نے میرے ساتھ کیا تھا، میں تمہارے ساتھ ویسا نہیں کروں گا۔ میں یہ چابی تمہیں واپس دیتا ہوں۔اگرچہ تم کافر ہو مگر بیت اللہ کی چابی کی ذمہ داری میں تمہیں سونپتا ہوں۔ جب آپ نے چابی اس کے ہاتھ میں دی تو وہ کہنے لگا، اے اللہ کے محبوب ﷺ! آپ نے چابی تو دے دی، اب آپ ﷺ میرے دل کا تالہ بھی کھول دیجیے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ چابی قیامت تک تمہارے خاندان میں چلتی رہے گی۔

ہم جیسا کوئی ہوتا تو بدلے لیتا کہ تم نے اس وقت یہ کیا تھا اور وہ کیا تھا......تو دیکھیے! اللہ کے محبوب ﷺ کے کیا اخلاق تھے۔اسی کو اخلاق عظیمہ کہتے ہیں۔اور یہ اخلاق ہمیں اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

دوستوں کے دل کیسے جیتے؟

نبی علیہ السلام کی مبارک زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ایک مرتبہ آپ ﷺ سفر پر تشریف لے جا رہے تھے اور ایک صحابی ساتھ تھے۔ایک جگہ رکے۔حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی علیہ السلام نے ایک درخت سے دو مسواک بنائے، ان میں سے ایک مسواک سیدھا اور خوب صورت تھا اور ایک ذرا ٹیڑھا تھا۔ نبی علیہ السلام نے سیدھا مسواک اس صحابی کو دے دیا اور ٹیڑھا مسواک اپنے پاس رکھ لیا۔اس صحابیؓ نے عرض کیا اے اللہ کے نبی ﷺ! میرا دل چاہتا ہے کہ یہ سیدھا مسواک آپ کے پاس ہو۔اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ سیدھا اور خوبصورت مسواک آپ کے پاس ہو۔دیکھا! کیسی تعلیمات دی ہیں!......شریکِ سفر اگر کوئی ہے تو اس کا بھی حق بنا دیا۔اگر زندگی کا چند قدموں کے لیے چلتے ہوئے کوئی شریک بن

جاتا ہے تو اس کا حق ہے، تو جو ایک گھر میں پیدا ہوئے، ایک ماں باپ کے نورِ نظر ہیں، ان کا ایک دوسرے پر کتنا حق ہوگا؟

چھوٹوں کے دل کیسے جیتے؟

نبی علیہ السلام چھوٹے بچوں کو بھی پیار سے سمجھاتے تھے۔ ایک لڑکپن کی عمر کے صحابی تھے جسے ہم (Teen ager) کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ مجھے عادت تھی کہ لوگوں کے درختوں سے جو پھل مجھے پسند آتا میں توڑ کے کھالیا کرتا تھا۔ اس وقت کا پھل کھجور ہی تھا۔ ایک دفعہ کھجور کے مالک نے مجھے پکڑ کر نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ نبی علیہ السلام نے مجھے پاس بلایا، میرا گمان تھا کہ مجھے ڈانٹ پڑے گی، مجھے مار پڑے گی، لوگوں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ مگر نبی علیہ السلام نے مجھے کچھ کہنے کی بجائے مجھ سے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ تم بغیر اجازت لوگوں کے پھل کیوں کھاتے ہو؟ میں نے کہا اللہ کے نبی ﷺ! مجھے اچھے لگتے ہیں، تو جس درخت کے پھل اچھے لگتے ہیں، وہ میں کھاتا ہوں۔ نبی علیہ السلام نے پیار سے فرمایا: دیکھو! جو پھل درخت پر لگے ہوتے ہیں، وہ ملکیت ہوتے ہیں اور جو پھل نیچے گر جاتے ہیں، اگر تم چاہو تو ان کو اٹھا کر کھالیا کرو۔ ایک اصول بتا دیا، جو جائز تھا۔ اس کے بعد نبی علیہ السلام نے دعا فرمائی: اے اللہ! اس کی بھوک دور فرما دے۔ اور دعا دیتے ہوئے نبی علیہ السلام نے اسے قریب کیا اور اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ وہ صحابیؓ فرماتے ہیں کہ نبی علیہ السلام کا محبت بھرا ہاتھ جب میرے سر پر آیا تو نبی علیہ السلام کی بات ایسے میرے دل میں بیٹھ گئی کہ میں نے اپنے دل میں یہ عہد کیا کہ آج کے بعد بغیر اجازت کے کسی کے پھل نہیں کھایا کروں گا۔

اب ذرا آنکھ بند کر کے ہم اپنے بارے میں سوچیں کہ اگر ہمارے ساتھ یہ معاملہ

پیش آتا تو ہم کیا کرتے؟ یا تو زبان سے کچھ بول دیتے یا ہاتھ سے کچھ کر دیتے، معاملے کو بگاڑ بیٹھتے، وہ بچہ سدھرنے کی بجائے الٹا دشمن بنتا اور پہلے سے زیادہ اسی کام کو کرنے پر آمادہ ہوتا۔ یہی بنیادی فرق ہے، اگر اچھے اخلاق سے انسان بات کرے تو وہ دوسرے کے دل میں اتر جاتی ہے، چنانچہ نبی علیہ السلام نے اچھے اخلاق کی تعلیم دی۔ ہر انسان اسی بات کا پابند ہے کہ وہ اچھے اخلاق اور اچھی عادات کو اپنائے۔ جو بندہ بھی دوسروں کے حقوق کا خیال رکھے گا، دوسروں کے بارے میں مثبت سوچ رکھے گا، دوسروں کو فائدہ دینے کی نیت رکھے گا، یقیناً وہ ان کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے گا۔ ایسا انسان اللہ رب العزت کی نظر میں قیمتی ہے۔

نبوّت کی انوکھی دلیل:

دیکھیے! نبی علیہ السلام کی ذات گرامی کی ایسی پیاری زندگی تھی کہ آپ سے پہلے جتنے انبیاء آئے، جب ان سے نبوت کی دلیل پوچھی گئی تو کسی نے اونٹنی کو پیش کیا، کسی نے عصا کو اژدھا بنا کر پیش کیا...... کسی نے مادرزاد اندھوں کو ٹھیک کر کے دکھا دیا...... کسی نے برص کے مریضوں کو ٹھیک کر کے دکھا دیا...... لیکن جب نبی علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ اگر اللہ کے نبی ہیں تو آپ کے پاس نبوت کی دلیل کیا ہے؟

جواب میں نبی علیہ السلام نے فرمایا:

﴿ لَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ ﴾

''تمہاری عقل کام نہیں کرتی! کیا میں اب تک تمہارے اندر زندگی نہیں گزار چکا۔''

تو نبی علیہ السلام نے نبوت کی دلیل کے طور پر اپنی گزری ہوئی زندگی کو پیش فرمایا۔

بڑا مشکل کام ہوتا ہے اپنی زندگی کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا۔ لیکن وہ زندگی اتنی صاف...... اتنی کھلی...... اتنی دھلی زندگی تھی کہ کافر بھی آپ ﷺ کی عظمتوں کے قائل تھے۔ کسی کو انگلی اٹھانے کی بھی جرات نہیں تھی۔ وہ دشمنی کی وجہ سے نبی علیہ السلام کو مجنون کہتے تھے، دشمنی کی وجہ سے جادوگر کہتے تھے، لیکن معاذ اللہ! کسی نے نبی علیہ السلام کو امانت میں خیانت کرنے والا نہ کہا۔ معاذ اللہ! جھوٹ بولنے والا نہ کہا وعدہ خلافی کرنے والا نہ کہا، اخلاقی اعتبار سے تو کوئی انگلی نہ اٹھا سکا۔ تو اتنی پیاری زندگی تھی کہ جب نبوت کی دلیل مانگی گئی تو نبی علیہ السلام نے اپنی مبارک زندگی کو نبوت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا۔ ذرا سوچیں نا! یہ کتنا مشکل کام ہوتا ہے!

پردے میں رہنے دو......!

میں اور آپ جب اپنے گھر میں ہوتے ہیں تو اپنی بیوی سے کہیں گے کہ ہماری آپس میں کوئی بات ہو گی تو تنہائی میں ایک دوسرے سے بحث کر لیں گے، ایک دوسرے کو سن سنا لیں گے، ایک دوسرے کو ڈانٹ لیں گے لیکن باہر بات مت کرنا۔ ہم بیوی سے کہیں گے کہ بس جو بھی ہے اندر ہی رکھنا باہر نہیں کرنا۔ لیکن محبوب ﷺ کی زندگی اتنی پیاری تھی کہ آپ ﷺ نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے فرمایا:

''اگر کوئی عورت تم سے میری اندرونِ خانہ زندگی کے بارے میں سوال کرے، تو تم اس بات کی پابند ہو، تمہارے اوپر فرض ہے کہ میری زندگی کو اس کے سامنے کھول کر بیان کرنا''

......اللہ اکبر! اللہ اکبر!...... کہ تنہائی کی باتیں بھی، تمہارا فرض ہے کہ تم لوگوں تک پہنچاؤ...... کیسی زندگی ہو گی......!

اپنے ہی اسیرانِ زلف:

آج ہماری حالت یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ ہمارے قریب ہوتا ہے، وہ اتنا زیادہ متنفر ہوا ہوتا ہے، کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے، توبہ توبہ کررہا ہوتا ہے، کہتا ہے، جی! اللہ کی پناہ...... کوئی ساتھ مل کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن نبی علیہ السلام کا معاملہ دیکھیے، جو جتنا زیادہ قریب تھا، وہ اتنی زیادہ محبت کرنے والا تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے عورتوں میں جو ایمان لائیں، وہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں۔ بھلا بیویاں بھی کسی کو مانتی ہیں؟ باہر نصیحت کرنا بہت آسان اور گھر میں نصیحت کرنا بڑا مشکل کام۔ بیویاں تو مانتی ہی نہیں۔ لیکن اللہ رب العزت کے محبوب کی عظمتوں پر قربان کہ سب سے پہلے کلمہ پڑھنے والی اپنی بیوی تھی۔ پھر رشتہ داروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے قریب تھے، وہ بچوں میں سب سے پہلے کلمہ پڑھنے والے بن گئے۔ پھر دوستوں میں سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سب سے زیادہ قریب تھے، وہ سب سے پہلے کلمہ پڑھنے والے بن گئے۔ جو جتنا زیادہ قریب تھا، وہ اتنا زیادہ کلمہ پڑھنے والا بن گیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کھلی، دھلی اور پیاری اور انوکھی زندگی تھی۔

یہ اچھے اخلاق ہوتے ہیں جو بندے کا دل موہ لیتے ہیں۔ انسان لوگوں کے دلوں میں بس جاتا ہے، لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے، یہ اچھے اخلاق ایسی نعمت ہیں۔ تو انسان اچھے اخلاق سے زندگی گزارے، خود بھی سکھی رہے اور اللہ کے بندوں کو بھی سکھ دے۔

خوش خلقی عبادت ہے:

کسی مومن کو خوش خلقی سے پیش آنا، اللہ رب العزت کے نزدیک یہ بھی عبادت ہے، کھلے چہرے کے ساتھ...... کھلی پیشانی کے ساتھ...... بشاشت کے ساتھ پیش

آنا۔ چنانچہ حدیث پاک میں آتا ہے:

''جو مسلمان بھائی کو ملتے ہوئے مسکرا کے ملتا ہے، اس کا یہ مسکرانا بھی صدقہ کرنے میں لکھا جاتا ہے، اور جب مصافحہ کرتے ہوئے ان کے ہاتھ ملتے ہیں تو ان کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے جھڑ جایا کرتے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں کہ میرے بندے پیار اور محبت سے ملیں، تو یہ اچھے اخلاق ہم اپنے اندر پیدا کریں، تاکہ ہم دوسروں کے لیے آرام کا سبب بن سکیں اور خوشیوں کا سبب بن سکیں۔

ویراں نال زندگی دی بہار:

آج حالت یہ ہے کہ صلہ رحمی کا جتنا زیادہ شریعت نے حکم دیا، اتنا زیادہ ہم رشتوں ناتوں پر چھریاں پھیرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بات پر دو بھائی آپس میں بولنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ہمیں بھائی کے مرتبے کا پتہ ہی نہیں۔ دونوں بھائی جوان ہوتے ہیں، بھائی سے محبت نہیں کریں گے بلکہ دوسرے لڑکوں سے محبت کریں گے۔ اور یہ قرب قیامت کی علامت ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''قرب قیامت میں ایسا وقت آئے گا کہ انسان دوسروں سے محبت کرے گا اور جن سے صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے ان کے ساتھ تعلق توڑے گا۔''

تو آج بھائی سے دوستی کوئی نہیں کرتا، کرتے ہیں تو غیروں سے، بھئی! اپنے بھائی کو ہی دوست بناؤ! ماں باپ کا دل خوش ہوگا، اللہ رب العزت خوش ہوں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلق کو جوڑنے کا حکم دیا ہے۔

حق سچ تو یہ ہے کہ بندے کے اوپر جب بھی مصیبت آتی ہے، نظر پڑتی ہے تو

بھائی پر ہی پڑتی ہے۔قرآن عظیم الشان سے مثال

...... جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ محسوس کیا کہ میں اکیلا ہوں اور میرے سامنے فرعون ایک Established (مستحکم) گورنمنٹ رکھنے والا بادشاہ ہے، اور اس کے ساتھ اس کی پوری قوم ہے، تو میرا بھی کوئی ساتھی ہونا چاہیے، معاون ہونا چاہیے۔اب جب نبوت کا بوجھ پڑا تو اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے ایک نبی علیہ السلام کی نظر فوراً کس پر پڑی......؟ کیا دعا مانگتے ہیں؟

﴿رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ o وَ یَسِّرْلِیْ اَمْرِیْ o وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ o وَ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ o وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ o هَارُوْنَ اَخِیْ o﴾ (طٰہٰ: ۲۵۔۳۰)

''اے رب میرا سینہ کھول دیجیے۔اور میرا کام آسان فرما دیجیے۔اور میری زبان کی گرہ کھول دیجیے۔تاکہ لوگ میری بات کو سمجھ سکیں۔اور مقرر کر دیجیے ایک وزیر میرے کنبے میں سے۔یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے۔''

تو معلوم ہوا کہ دنیا میں جب مشکل پڑی تو نظر کس پر گئی؟ بھائی پر گئی۔اور آخرت میں بھی جب مشکل پڑے گی...... یہ اور بات ہے کہ وہاں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، تاہم جب بندے پر مشکل پڑے گی، تو سب سے پہلے رجوع کس سے کرے گا؟

قرآن میں فرمایا:

﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ﴾

یہاں پر ''ابی'' کا نام نہیں لیا...... ''امی'' کا نام نہیں لیا۔سبحان اللہ!

﴿یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ﴾

سب سے پہلے بندہ بھائی کی طرف رجوع کرے گا۔

تو ہم ذرا اپنے بھائی سے دوستی کر کے تو دیکھیں۔ پھر دیکھنا اللہ تعالیٰ کیسے رحمت فرماتے ہیں۔ جب یہ تعلق ماں باپ کی طرف سے بھی ہو اور پھر دین کی نسبت سے بھی ہو جائے تو یہ ''نورٌ علیٰ نور'' بن جاتا ہے۔

پیوستہ رہ شجر سے:

آج حالت یہ ہے کہ اگر نوجوان بچے کو اس کے ماں باپ تربیت کی خاطر سمجھا دیں، تو بس ...... وہ غصے میں گرم ہو جاتا ہے۔ ...... میں یہاں سے چلا جاؤں گا! پھر شیطان اسے سمجھاتا ہے کہ بس! تم یہاں سے چلے جاؤ گے نا! تو تمہاری ساری پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ دیکھیں! یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے بازو یہ سوچے کہ میں خوامخواہ بدن کے ساتھ لٹکا ہوا ہوں، میری آزادی اسی میں ہے کہ میں بدن سے جدا ہو جاؤں۔ اچھا! اگر یہ جسم سے جدا ہوگا تو کیا ہوگا؟ اس میں کیڑے پڑیں گے، اس کو کتے کھائیں گے، اس کی ہڈیاں توڑیں گے، اسے پچھوڑیں گے، گلیوں میں گھسیٹا جائے گا، اس بازو کے اندر بدبو پڑے گی۔ یہ سب کیوں ہوگا؟

اس لیے کہ یہ مرکز سے جدا ہوا۔ بالکل ایسے ہی جو نوجوان بچہ یہ سمجھتا ہے کہ میری آزادی اس میں ہے کہ میں اپنے ماں باپ سے جدا ہو جاؤں، تو اس کا بھی یہی حال ہوگا، اسے ایسے دوست ملیں گے جو اس کے ایمان کو خراب کریں گے، اسے جہنم کا ایندھن بنائیں گے، نہ دین کا رہے گا نہ دنیا کا۔

والدین کا سایہ عاطفت:

آج نوجوانوں میں اتنا حوصلہ نہیں کہ اگر والدین اچھی بات کہہ رہے ہیں تو ان میں قبولیت کا مادہ ہو۔ بھئی! کہہ تو تمہارے فائدے کے لیے رہے ہیں نا! اچھا! اگر

والدین کہنا چھوڑ دیں تو نقصان کس کا ہوگا؟ اولاد کا ہی نقصان ہے، ماں باپ تو اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر وہ Unconsult (لاتعلق) بن جائیں کہ جاؤ بھئی! اللہ کے حوالے۔ اگر تم ہماری بات نہیں مانتے تو ہم تمہیں اللہ کے حوالے کرتے ہیں، اس میں نقصان تو بچے کا ہی ہوگا کہ اس کے سر پر سایہ نہ رہے گا۔

برکات کے محور:

حدیث پاک میں فرمایا گیا:

اَلْبَرَکَۃُ مَعَ اَکَابِرِکُمْ

''تمہارے لیے برکت بڑوں کے ساتھ رہنے میں ہے۔''

اور شیطان کہتا ہے کہ بس تم علیحدہ ہو جاؤ۔ جن رشتوں کو رب کریم نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، ہم ان رشتوں کو توڑ رہے ہوتے ہیں۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ شب قدر میں بڑے بڑے گناہ گاروں کی مغفرت ہو جاتی ہے، لیکن چند بندوں کی مغفرت نہیں ہوتی، ان میں سے ایک وہ جو رشتوں ناتوں کو توڑنے والا ہو، شب قدر میں بھی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت نہیں فرماتے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ قطع تعلقی کرنا اللہ رب العزت کے نزدیک کتنا برا کام ہے۔

معاملات خراب ہونے کی وجہ:

دینِ اسلام ہمیں اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بنا کر رکھیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بندہ سلجھانے کی نیت کرلے تو بڑے بڑے مسئلے سلجھا لیتا ہے اور اگر الجھانے پر آجائے تو ہر بات الجھ جاتی ہے۔ الجھانا کون سا مشکل کام ہے؟ ہمیں چاہیے کہ ہم معاملات کو سلجھانے کی کوشش کیا کریں۔

معاملات خراب کیسے ہوتے ہیں؟ غصے کی وجہ سے...... ذرا سی بات پر آپے سے

باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسی بات کر دی کہ بیوی سارا دن روتی رہی۔ ایسی بات کر دی کہ دوسرے بھائی کا دل دکھ گیا۔ یاد رکھیے! ''بیماریوں میں سے سب سے بری دل کی بیماری اور دل کی بیماریوں میں سے سب سے بری دل آزاری۔''

کسی کا دل توڑ دینا...... آج ہم اس کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ اور ہم کن کا دل توڑتے ہیں؟...... اپنوں کا۔ کسی نے کیا خوب کہا:

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا
دلِ دشمناں راہم کردن نہ تنگ
تُرا کہ میسر شَوَدی مقام
کہ با دوستاں راہم پے کارِ جنگ

''میں نے سنا ہے کہ جو مردانِ رہِ خدا ہوتے ہیں، وہ تو دشمنوں کے دل بھی تنگ نہیں کیا کرتے، تجھے یہ مقام کہاں سے ملا کہ تو اپنوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہے!''

چنانچہ آج معمولی بات پر بھائی بہن کے گھر جانا چھوڑ دیتا ہے۔ حیرت کی بات ہے!

غصہ پینے کا انعام:

اللہ مارے اس غصے کو، اس نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا، جس کسی سے پوچھو، دوسرے کی رپورٹ...... دماغ گرم...... دماغ B o i l (ابل) کر رہا ہوتا ہے، بھاپ بنی رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، مومن ایسے غصے کو دباتا ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے:

''اگر کسی شخص کے ساتھ کسی نے زیادتی کی اور یہ بندہ بدلہ لے سکتا تھا، مگر اللہ

کی خاطر یہ اس کو معاف کر دے، تو اللہ رب العزت اس معاف کرنے کی وجہ سے، قیامت کے دن اس کو اپنے چہرے کا دیدار عطا فرمائیں گے۔‘‘

تو بھئی! آج جو بندہ غصے کا گھونٹ پیے گا، کل کو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دیدار کا شربت پلائیں گے، کتنا مزے کا سودا ہے......!

اس غصے سے اللہ کی پناہ مانگیں، یہ انسان کی زندگی اجیرن بنا کر رکھ دیتا ہے۔ ہاں! اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ بندہ انتظامی امور میں بھی نہ سمجھائے، اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے، وگرنہ بات سمجھ نہیں آتی ......لیکن ایک غصہ یہ ہوتا ہے کہ بس! Flash up (آگ بگولا) ہو جانا، ذرا سی بات پر اسی وقت بھڑک اٹھنا، ایسا ٹھیک نہیں، تھوڑا تحمل مزاجی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

برائی کا بدلہ بھلائی

نبی علیہ السلام حلیم تھے۔ حلیم کس کو کہتے ہیں؟ حلیم کہتے ہیں جو دوسرے کو سزا دینے میں ذرا توقف کرے، دیر کرے، اس کو حلیم کہتے ہیں۔ تو نبی علیہ السلام حلیم الطبع تھے، ہمیں بھی اپنے اندر حلم پیدا کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ﴾

’’نیکی اور برائی برابر تو نہیں ہو سکتی۔‘‘

﴿اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾

’’تم برائی کو نیکی کے ساتھ دھکیلو‘‘

جب برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو گے تو تمہارے اور اس کے درمیان جو عداوت تھی وہ ختم ہو جائے گی اور وہ تمہارا جگری یار بن جائے گا۔ یہ اچھائی ایسی چیز ہے کہ دشمنوں کو بھی دوست بنا دیتی ہے۔

نفع رسانی کا انعام:

اس لیے یہ خوش اخلاقی ہمیں اپنے اندر پیدا کرنی ہے، اس کو سیکھنا ہے اور اس پر پوری زندگی گزارنی ہے۔ پھر اس کی برکتیں دیکھیے گا۔ اللہ رب العزت کی طرف سے رزق میں برکت، صحت میں برکت، عزت میں برکت، ہر ہر چیز میں اس کی وجہ سے برکت آئے گی۔ کیوں؟

اس لیے کہ اللہ کا وعدہ ہے:

﴿ وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ﴾

''جو دوسروں کی نفع رسانی کا کام کرے گا، اللہ اس کے قدم زمین میں جما دے گا۔''

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے قدم زمین میں جما دیے جائیں تو ہم دوسروں کی خیر خواہی کریں۔ سب کا بھلا چاہیں، سب کا بھلا سوچیں۔

یہ قدم زمین میں جمنے کیسے ہیں؟

جب بندے کے پاس رزق اچھا ہو...... صحت ہو...... جب بندے کے پاس کاریں اور بہاریں ہوں...... معاشرے میں عزت ہو، تو لوگ کہتے ہیں، ماشاء اللہ! اس بندے کے قدم جم گئے ہیں!

خیر خواہی کی قدردانی:

یہ خیر خواہی اللہ رب العزت کو اتنی پسند ہے کہ پروردگار عالم خیر خواہ بندے سے محبت فرماتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دفعہ سلیمان علیہ السلام اپنے لشکر کے ساتھ جا رہے تھے، راستے میں چیونٹیاں جا رہی تھیں۔ ایک چیونٹی نے محسوس کر لیا کہ لشکر آ رہا ہے، اس نے دوسری چیونٹیوں سے کہا کہ تم بلوں میں گھس جاؤ۔

﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰکِنَکُمْ ﴾ (النمل:۱۸)

''اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔''

کیونکہ سلیمان علیہ السلام کا لشکر آ رہا ہے اور تم راستے میں چل رہی ہو، ایسا نہ ہو کہ ان کا لشکر بے دھیانی میں تمہیں پاؤں کے نیچے مسل دے۔ تم جلدی جلدی اپنے بلوں میں داخل ہو جاؤ۔ اب چیونٹی کتنی چھوٹی سی مخلوق ہے، اس نے دوسری چیونٹیوں کی خیر خواہی کی اور یہ خیر خواہی اللہ کو اتنی پسند آئی کہ اس بات کو قرآن پاک میں Mension (مذکور) فرمایا اور اس صورت کا نام ''النمل'' چیونٹی کے نام پر رکھ دیا۔ سوچنے کی بات ہے، اگر ایک چیونٹی دوسری چیونٹیوں کی خیر خواہی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کا تذکرہ قرآن میں فرماتے ہیں، تو اگر بندۂ مسلمان اللہ کے بندوں کی خیر خواہی کرے گا، تو اللہ رب العزت کیوں نہ خوش ہوں گے......!

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کریں، دوسروں کا بھلا سوچیں، اچھا سوچیں۔ اپنے آپ کو مشقت میں ڈال کر بھی دوسروں کو نفع پہنچائیں تو اللہ کا احسان جانیں۔

دو لفظوں میں پورا دین:

دین اسلام ایک عجیب دین ہے۔ نبی علیہ السلام نے دو لفظوں میں پورا دین سمجھا دیا۔ فرمایا:

﴿ اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃ ﴾

''دین سراسر خیر خواہی ہے۔''

یہاں طلبا، علما کے لیے ایک علمی نکتہ ہے...... عام طور پر متبدا خبر میں ایک معرفہ ہوتا ہے اور دوسرا نکرہ ہوتا ہے۔ مگر یہاں دونوں معرفہ ہیں۔ الدین ...... النصیحہ دونوں کو معرفہ کیوں لائے؟ علماء نے لکھا ہے کہ جب متبدا اور خبر میں سے

دونوں کو معرفہ لایا جائے، تو وہاں پر دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے، دونوں ایک دوسرے کے محصور ہوتے ہیں، مقید ہوتے ہیں۔ کیا مطلب؟...... فرمایا: ''دین وہی ہے جو خیر خواہی ہے، اور جہاں خیر خواہی ہے، وہی سراپا دین ہے۔'' یہ آپس میں لازم وملزوم ہیں...... جہاں آپ دین دیکھیں گے، وہاں آپ کو خیر خواہی نظر آئے گی، اور جہاں آپ کو خیر خواہی نظر آئے گی، وہیں آپ کو دین نظر آئے گا۔ دین اور بدخواہی، یہ دونوں چیزیں کبھی اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ دین موجود ہو اور بندے کے اندر بدخواہی ہو۔ اس لیے مومن ہمیشہ دوسروں کا خیر خواہ ہوتا ہے، اپنا بھی خیر خواہ، دوسروں کا بھی خیر خواہ، ہر ایک کا خیر خواہ۔ تو بھئی! ہم نے خیر خواہی سیکھنی ہے، اللہ کے بندوں کی خیر خواہی، ایمان والوں کی خیر خواہی، یہ مقصدِ زندگی ہے۔

درسِ اخلاق کی ضرورت:

جب آپ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بدخواہ دیکھیں، تو سمجھ لیں کہ دین کی دھجیاں اڑ چکیں، دین کے پرخچے اڑ چکے، اب دین درمیان میں نہیں رہا۔ اور آج تو ہم دین والے، جنہوں نے وضع قطع دین داروں والی بنائی ہوتی ہے، آپس میں الجھ رہے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے سینگ نہیں سماتے، اکٹھا مل کر رہنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے۔ شاید سینگوں والے جانوروں کو اکٹھا کمرے میں رکھ دیں تو وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ رہ لیں گے، اور اگر ہم بے سینگ کے جانوروں کو اکٹھا رکھیں تو ہماری ایک دوسرے سے نہیں بنے گی۔

کیا وجہ ہوتی ہے؟

اخلاق نہیں سیکھے ہوتے، کسی نے اخلاق کا درس نہیں دیا ہوتا، کسی نے بتایا نہیں ہوتا کہ اخلاق کی اللہ کے ہاں کیا قیمت ہے۔ یہ سمجھنے کی بات ہے، یہ درس سن کر دلوں میں نقش کرنے کے قابل ہوتے ہیں، تاکہ ہم صحیح معنوں میں مسلمان بن کر زندگی

گزاریں۔ دوسروں کے حقوق کی رعایت کریں، دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔

پڑوس کی قیمت:

مجھے ایک آدمی نے کسی صاحب کے بارے میں بات کی کہ حضرت! جو فلاں بندہ ہے نا! بچے اس کے قریب بھی رہنا پسند نہیں کرتے، بچے اس سے پریشان ہی رہتے ہیں، ہر ایک کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے۔ میں نے اس کے کہا کہ جب ہم صحیح معنوں میں مسلمان تھے تو اس وقت ہمارے پڑوس کی قیمتیں بڑھ جایا کرتی تھیں، پھر میں نے اسے واقعہ سنایا۔

عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ امیر المومنین فی الحدیث تھے، محدثین میں ان کا بڑا مقام ہے۔ بلکہ جتنی تعریفیں اسماء الرجال کی کتب میں عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی کی گئی ہیں، کسی اور محدث کی اتنی تعریفیں نہیں کی گئیں۔ ایسے مانے ہوئے بزرگ تھے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں ایسے الفاظ نہیں کہے گئے، جیسے متفقہ طور پر حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں کہے گئے۔

ان کے حالاتِ زندگی میں لکھا ہے کہ ان کے ہمسائے میں ایک یہودی رہتا تھا، وہ مکان بیچنا چاہتا تھا۔ خریدنے والا پہنچا اور اس نے پوچھا کہ آپ نے مکان بیچنا ہے، اس نے کہا جی ہاں! کتنے میں بیچیں گے؟ کہنے لگا دو ہزار دینار میں بیچوں گا۔ خریدنے والے نے کہا: بھئی! اس مکان کی قیمت اس ایریا میں ہزار دینار ہے۔ ہزار دینار کافی ہے اور آپ دو ہزار مانگ رہے ہیں؟ وہ کہنے لگا کہ ہاں! مکان کی قیمت تو ایک ہزار دینار ہی ہے اور دوسرا ہزار دینار عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے پڑوس کی قیمت ہے۔ یہ بات یہودی کر رہا ہے۔

ایک وقت تھا کہ ہم جس مکان میں رہتے تھے، اس گھر کے پڑوس کی قیمتیں بڑھ جایا کرتی تھیں۔ اس وقت ہمارے اندر اخلاق ہوتے تھے، ہم دوسروں کا بھلا سوچتے

تھے۔

خیر خواہی ہو تو ایسی!

ہمارے اسلاف دوسروں کا کتنا بھلا سوچتے تھے، سنیے اور دل کے کانوں سے سنیے۔ جابر بن عبداللہ البجلی تابعین میں سے ہیں۔ انہوں نے کسی سے گھوڑا خریدا۔ فرض کیجیے سات ہزار کا خریدا۔ گھوڑا خرید کر گھر لائے۔ جب گھوڑا خریدا جاتا تو صاف ظاہر ہے کہ لوگ دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ اگلے دن لوگ دیکھنے آ گئے۔ انہوں نے آ کر دیکھا اور کہا، ماشاء اللہ! بڑا اچھا سودا کر کے آئے، بڑا اچھا خرید لیا، ویسے لگتا تو یہ کہیں آٹھ ہزار کا ہے۔ آپ کو بڑے مناسب دام میں مل گیا۔ وہ لوگ یہ کہہ کر چلے گئے۔ تو یہ دوسرے دن گئے اور گھوڑے کے مالک کو ایک ہزار دینار اور دیئے اور کہا کہ بھئی! لوگ کہتے ہیں کہ یہ آٹھ ہزار کا ہے، میں نے تو آپ سے کم قیمت پر لیا۔ اگلے دن کوئی اور دیکھنے والا آ گیا۔ اس نے جب آ کر دیکھا تو کہا کہ یہ گھوڑا تو بہت اچھا ہے، مجھے تو بہت اچھا لگا، مجھے تو بڑا پسند آیا، میری نظر میں تو اس کی قیمت نو ہزار تھی اور تمہیں یہ آٹھ ہزار میں مل گیا۔ یہ پھر اگلے دن گئے اور خاموشی کے ساتھ اس کے مالک کو ایک ہزار دینار اور دیے۔ اب مالک نے کہا کہ آپ بار بار پیسے کیوں دیے جا رہے ہیں، میں نے اس قیمت میں بخوشی آپ کے ہاتھ فروخت کیا تھا؟ انہوں نے فرمایا کہ ''خیر خواہی'' کی وجہ سے۔ ہم نے اپنے اساتذہ کے ہاتھوں پر بیعت کی ہوئی ہے کہ ہم مومن کی خیر خواہی کریں گے۔ تمہیں اپنے گھوڑے کی قیمت کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ میں نے لوگوں سے رائے پوچھی۔ کتنے ہی لوگوں نے اس کی قیمت نو ہزار بتائی۔ میں آپ کا نقصان نہیں بلکہ بھلا چاہتا ہوں، اس لیے میں نے آپ کو اوپر کے دو ہزار روپے بھی دے دیے۔ کبھی ہم دوسروں کے اتنے خیر خواہ ہوا کرتے تھے۔

خیر خواہی کی انوکھی مثالیں:

جب اسلام کا دنیا پر غلبہ تھا، تو مسلمان پوری دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔ اس وقت کفار نے ایک آدمی بھیجا کہ جاؤ پتہ کر کے آؤ، ان مسلمانوں کے اندر کیا خاص چیز ہے کہ یہ جدھر جاتے ہیں کامیابیاں ان کے قدم چومتی ہیں، دوسرے لوگوں کو بڑا متاثر کر لیتے ہیں اور ان کو مسلمان بنا دیتے ہیں۔ بغداد اس وقت مسلمانوں کا مرکز تھا۔

چنانچہ وہ بغداد آیا کہ دیکھوں کہ آخر وجہ کیا ہے؟ جب وہ شہر میں آیا تو دو پہر کے وقت اس کو بھوک لگی۔ وہاں ایک ہوٹل تھا، وہ کھانا کھانے کے لیے اس ہوٹل میں بیٹھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے قریب ہی ایک اور بندہ بیٹھا کھانا کھا رہا ہے اور اس کی طرف بار بار دیکھ رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ میں اجنبی ہوں، اس لیے مجھے دیکھ رہا ہوگا۔ جب اس نے کھانا کھا لیا اور کاؤنٹر پر آ کر پوچھا کہ میں نے آپ کو کتنے پیسے دینے ہیں؟ کاؤنٹر والے نے جواب دیا کہ جناب! آپ کے پیسے تو ادا ہو چکے۔ اس نے پوچھا، جی! کیسے ادا ہو چکے؟ کھانا تو میں اب کھا کر آیا ہوں۔ اس نے بتایا کہ آپ کے ساتھ وہ جو دوسرا بندہ بیٹھا ہوا تھا، وہ مقامی تھا۔ وہ جب اپنے پیسے دینے آیا تو مجھے کہنے لگا کہ یہ شخص پردیسی نظر آتا ہے، یہ مہمان ہے، چلو اس کے پیسے میں دے دیتا ہوں، میری طرف سے ان کی دعوت سہی۔ اور اس نے آپ کو بتایا بھی نہیں، کیونکہ وہ اس کے بدلے میں آپ سے شکریہ کے الفاظ بھی نہیں چاہتا تھا، بلکہ اللہ سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ لہٰذا آپ کا بل ادا کر کے چلا گیا۔ یہ شخص بڑا حیران ہوا کہ یہ ایسے لوگ ہیں۔ مہمان نوازی بھی کرتے ہیں اور پتہ بھی نہیں چلنے دیتے کہ کس نے مہمان نوازی کی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔

وہ شخص آگے چلا، اس کو کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت تھی۔ ایک دکان پر اس نے وہ چیز دیکھی، اس نے دکاندار سے کہا کہ مجھے یہ چیز چاہیے۔ دکاندار نے کہا کہ

ہاں! لے لو۔ کتنے میں دو گے؟اس نے جواب دیا اتنے میں دوں گا۔نو وارد نے کہ ٹھیک ہے ایک دے دو۔دکاندار کہنے لگا کہ بھئی! آپ تھوڑی سی تکلیف کریں ،وہ سامنے دکاندار سے یہی چیز اتنے ہی پیسوں میں مل جائے گی ،آپ مہربانی فرما کراس سے لے لیں۔اس نے دوسری دکان سے جا کر چیز تو خرید لی لیکن اس کے دل میں خیال آیا کہ پہلے دکان دار نے چیز کیوں نہ دی؟اس نے واپس آکراس سے پوچھا: کیا آپ کے پاس چیز موجود نہیں تھی یا دینی پسند نہیں کی؟اس نے جواب دیا کہ چیز تو موجود تھی لیکن میں نے چاہا کہ آپ میرے ہمسائے سے خرید لیں۔اس نے کہا دکاندارتو ایسا نہیں کرتے کہ میری بجائے اس سے خرید لیں۔اس نے جواب دیا کہ ایسا میں نے اس لیے کیا کہ آج میرے پاس اتنے گاہک آگئے کہ میرے اخراجات پورے کرنے کے لیے کافی تھے،لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ میرے اس بھائی کے پاس کوئی گاہک نہیں آیا۔میرے دل میں خیال آیا کہ آپ اس سے وہ چیز خرید لیں گے،اس کو بچت ہو جائے گی اوراس کے بیوی بچوں کی روٹی کا انتظام ہو جائے گا۔

عمل سے زندگی بنتی ہے:

ایک وقت تھا کہ آمنے سامنے والے دکاندار ایک دوسرے کے اتنے خیر خواہ ہوتے تھے۔اللہ اکبر کبیراً۔اورآج اپنی حالت ہم خود دیکھ سکتے ہیں،اندازہ لگا سکتے ہیں۔اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔تو یہ اچھے اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کی ضرورت ہے،زبانی کلامی اچھے نہیں بن سکتے جب تک کہ عمل ساتھ نہ ہو۔بندے کی شخصیت کی عمل سے تصدیق ہوتی ہے۔اگر ہم اچھے اخلاق کو اپنائیں گےتو اللہ کے مقبول بندوں میں شمار ہوں گے۔

انوکھا مقدمہ اور نرالا فیصلہ:

سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانہ تھا۔ایک آدمی نے زمین بیچی اور دوسرے نے

خریدی۔ جب خریدنے والے نے ہل چلائے تو اس زمین میں سے کچھ خزانہ نکل آیا۔ اس نے سوچا کہ میں نے تو صرف زمین خریدی تھی، خزانہ تو نہیں خریدا تھا۔ لہٰذا خزانہ اسی کا ہے جس نے زمین فروخت کی۔ وہ ان کے پاس گئے اور کہا: بھائی! یہ آپ کا خزانہ چھپا ہوا تھا، آپ واپس لے لیں۔ آگے سے اس بیچنے والے نے جواب دیا کہ بھائی! جب میں نے اپنی زمین بیچ دی، اب زمین سے جو بھی فائدہ ہو وہ آپ کا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ نہیں میں نے صرف زمین کی قیمت ادا کی تھی، خزانے کی قیمت ادا نہیں کی، لہٰذا یہ خزانہ آپ کا ہے۔ آگے سے وہ کہے کہ نہیں اب ہر چیز آپ کی ہے۔ دونوں میں بحث چلتی رہی، مشورہ یہ ہوا کہ عدالت میں چلتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں دو مسلمان بھائیوں کے درمیاں یہ پہلا مقدمہ تھا جو عدالت میں پیش ہوا۔ اور وہ مقدمہ بھی ایسا کہ ایک فریق کہتا ہے یہ آپ کا حق ہے، اور دوسرا فریق کہتا ہے کہ نہیں یہ آپ کا حق ہے۔

آج عدالتوں میں مقدمے آتے ہیں، ایک فریق کہتا ہے کہ یہ میرا حق ہے اور دوسرا فریق کہتا ہے، نہیں! یہ میرا حق ہے۔ ایک کہتا ہے کہ میں اپنے حق کی حفاظت کے لیے خون کا آخری قطرہ بھی بہا دوں گا۔ دوسرا بھی کہتا ہے کہ میں خون کا آخری قطرہ بہادوں گا۔ جب اس نیت سے وہاں جاتے ہیں تو آج کی عدالتوں سے عداوتیں ملتی ہیں۔ جہاں عدالت دیکھو، سمجھ لو وہاں عداوت موجود ہے۔ جہاں عداوتیں ہوں وہاں عدالتیں ہوں گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں طرف عداوتیں ہیں۔ اس لیے جائز و ناجائز حقوق کے لیے جھگڑا کرتے ہیں کہ یہ میرا حق ہے اور وہ میرا حق ہے۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں کیا جھگڑا آرہا ہے؟

ایک بندہ کہتا ہے کہ یہ میرے بھائی کا حق ہے اور دوسرا کہتا ہے، نہیں! یہ میرا حق

نہیں بلکہ میرے بھائی کا حق ہے۔اب جس نے فیصلہ کرنا تھا، وہ بھی حیران کہ کس سے کہا جائے کہ اس کا حق ہے۔

اللہ نے ان حضرات کو سمجھ بھی بڑی دی تھی۔دونوں طرف سے مقدمہ سن لینے کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ لوگوں کے گھروں میں اولاد ہے۔ایک نے کہا کہ میری اولاد ہے، اور دوسرے نے کہا کہ میری بھی اولاد ہے۔معلوم یہ ہوا کہ ایک کے گھر میں بیٹا جوان ہے اور دوسرے کے گھر میں بیٹی جوان ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا فیصلہ یہ ہے کہ آپ دونوں اپنے بیٹے اور بیٹی کا آپس میں نکاح کر دیں اور یہ خزانہ اس بیٹی کے جہیز میں دے دیں۔پہلے وقتوں میں مسلمانوں کے جھگڑے ایسے ہوتے تھے۔

نہ ہو دین تو سجن بھی دشمن:

آج مسلمانوں کے جھگڑے کیا ہوتے ہیں؟

ایک بالشت زمین کی خاطر بندے مرتے ہیں۔بالشت زمین کی بات بھی چھوڑیے...... دو دوست ہیں، زندگی کے بیس سال دوست رہے۔آپس میں باتیں کر رہے ہیں مذاق میں۔باتیں کرتے کرتے بات بڑھ گئی تو ان میں سے ایک دوست نے دوسرے دوست کو قتل کر دیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے......؟؟؟

اس لیے کہ دین کا پتہ نہیں ہوتا۔ان کو دین سکھانے کی ضرورت ہے۔

مومن کو قتل کرنے پر اللہ تعالیٰ کا غضب:

ایک مسلمان بھائی کو قتل کرنا اتنا بڑا گناہ ہے! اتنا بڑا گناہ! کہ جتنا اللہ رب العزت نے اس گناہ کے کرنے پر غصہ فرمایا ہے اور کسی گناہ پر اتنا غصہ نہیں فرمایا۔سنیے

اور دل کے کانوں سے سنیے۔ جتنا رب العزت نے غصے کا اظہار اس گناہ پر کیا اور کسی گناہ پر اتنا غصے کا اظہار نہیں کیا۔ سنیے! قرآن عظیم الشان میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

﴿ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُهُ جَهَنَّمُ ﴾

''اور جو جان بوجھ کر مومن کو قتل کرے، اس کی جزا جہنم ہے''

اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ اس کو جہنم میں ڈالیں گے، قصہ ختم۔ مگر نہیں۔ اتنا جلال کا اظہار فرمایا کہ یہ کہنے کے بعد آگے فرمایا:

خَالِدًا فِيهَا

''ہمیشہ ہمیشہ اس میں رہے گا۔''

ارے! ہمیشہ ہمیشہ تو کافر، مشرک اور منافق رہتے ہیں۔ مگر فرمایا کہ نہیں! یہ اتنا برا کام ہے! یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا۔ یعنی بہت لمبا عرصہ رہے گا۔

اچھا! اگر یہ بھی کہہ دیتے کہ اتنا لمبا عرصہ جہنم میں رہنا پڑے گا تو یہ بھی بہت بڑی سزا تھی۔ مگر نہیں۔ اس پر غصہ ختم نہیں ہوا، آگے فرماتے ہیں:

﴿ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ ﴾ (النساء: ۹۳)

''اور اس پر اللہ کا غضب ہوگا۔''

اگر اتنا ہی کہہ دیتے تو بہت تھا کہ...... جہنم میں ڈالیں گے...... لمبا عرصہ جہنم میں رہیں گے، اتنا کہہ دیتے تو کافی تھا، مگر نہیں! گناہ اتنا بڑا تھا کہ پھر بھی غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ آگے فرمایا:

﴿ وَلَعَنَهُ ﴾

اس پر اللہ رب العزت کی لعنت ہوگی۔

کسی مومن کو قتل کر دینا اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ رب العزت نے اس پر غصہ در غصہ کا اظہار فرمایا...... اب پوری آیت سن کر ذرا تصور کیجیے کہ کتنا غصے کا اظہار فرمایا:

قربِ قیامت کی نشانی:

اور آج سب سے آسان کام یہی نظر آتا ہے۔ اور یہ قرب قیامت کی علامت ہے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا:

''قرب قیامت کے علامات میں سے ایک یہ ہے کہ مومن کو قتل کیا جا رہا ہوگا اور اس کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ مجھے کس گناہ کی وجہ سے مارا جا رہا ہے۔''

اور آج تو لوگ نمازوں کے لیے مسجدوں میں آتے ہیں اور ان کو یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ واپس گھر بھی جائیں گے کہ نہیں جائیں گے اور کہنے کو اسلام کے بڑے ٹھیکیدار بنتے ہیں۔

مومن کی شان اور رتبہ:

اس لیے ہمیں اخلاق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ مومن کی شان اور مومن کا رتبہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ابوداؤد شریف کی روایت ہے کہ نبی علیہ السلام نے ایک مرتبہ بیت اللہ شریف کی طرف دیکھا اور فرمایا:

بیت اللہ! اللہ تعالیٰ کے ہاں تیرا مقام بہت بڑا ہے، لیکن

حُرْمَةُ الْمُؤْمِنِ اَرْجَحُ مِنْ حُرْمَةِ الْكَعْبَةِ

''اللہ رب العزت کی نظر میں ایک مومن کی عزت بیت اللہ کی عزت سے بھی زیادہ ہے''

اب بیت اللہ کو جا کر لپٹتے پھرتے ہیں۔ غلاف پکڑ پکڑ کر دعائیں مانگتے ہیں لیکن مومن کی توہین کرتے پھرتے ہیں، مومن کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ مؤمن پر تو نگاہ ہی نہیں ٹکتی۔ کہتے ہیں، میں تجھے کیا جانوں! آپ سنتے نہیں ایسی باتیں؟ تیرے جیسے کو خرید کر یہ کر دوں۔ یہ باتیں کس لیے کرتے ہیں؟ اس لیے کہ

انہوں نے اخلاق کا درس سنا ہی نہیں ہوتا۔ پتہ ہی نہیں ہوتا کہ زندگی گزارنی کیسے ہے۔

کر بھلا ...... ہو بھلا:

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ کے بندوں کے لیے رحمت بن کر رہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ یَرْحَمُکُم مَنْ فِی السَّمَاءِ

''تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا''

اللہ تعالیٰ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ اچھے اخلاق سے زندگی گزارنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ ہم سیکھیں کہ اچھے اخلاق کیا ہوتے ہیں۔

شرم تم کو مگر نہیں آتی:

☆ ...... ہم سے تو صندل کا درخت اچھا۔ کیونکہ صندل کا درخت اس کلہاڑے کے منہ کو بھی خوشبودار بنا دیتا ہے جو کلہاڑا اس کو کاٹتا ہے۔

☆ ...... ارے! ہم سے تو پھول کی پتیاں اچھی۔ جو انسان پھول کی پتیوں کو مسل دیتا ہے، یہ پتیاں ان ہاتھوں کو بھی خوشبودار بنا دیتی ہیں۔

☆ ...... ہم سے تو درخت اچھا! بیری کے درخت پر لوگ پتھر پھینکتے ہیں تو وہ ادھر سے بیر گراتا ہے۔ لوگوں نے اسے پتھر مارے، اور اس درخت نے اس پتھر مارنے والوں کو بھی اپنے پھل عطا کیے۔

کاش! ہم بھی اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کو کوئی اچھائی دیتے۔ لیکن اچھائی تو تب دیں جب ہمارے اندر کوئی اچھائی ہو۔ اگر اندر ہی گند بھرا ہوا ہو تو وہ گند ہی باہر

آئے گا۔اچھے بھلے نمازی حاجی صاحب نے ذرا سی بات پر ننگی گالیاں دینا شروع کر دیں۔ذرا چھیڑ کے دیکھیے، ذرا غصے کا موقع آیا تو حقیقت کھل جاتی ہے۔ساری زندگی میں انہوں نے یہی کچھ سیکھا۔

ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو کچھ سنوارنے کی کوشش کریں۔موت سے پہلے خدا کا بندہ بن کر رہنا سیکھیں۔اپنے اندر اچھے اخلاق پیدا کر لیں۔

تین قیمتی باتیں:

تین باتیں ذہن میں رکھیے:

(۱) اگر ہم کسی کے ساتھ اچھائی نہیں کر سکتے تو کم از کم برائی بھی تو نہ کیا کریں۔

(۲) اگر ہم کسی کو سکھ نہیں دے سکتے تو ہم کسی کو دکھ بھی تو نہ دیا کریں۔

(۳) اگر ہم کسی کی تعریف نہیں کر سکتے تو بد تعریفی بھی تو نہ کریں......

نہیں تعریف کر سکتے، زبان چھوٹی سی ہے، تعریف گوارا نہیں تو بند رکھو اس زبان کو! کیوں کھولتے ہو؟

معاملات سے پتہ چلتا ہے:

کسی بندے کے اخلاق کا پتہ اس کے معاملات سے چلتا ہے۔ایک صاحب نے کسی کی بڑی تعریف کی۔عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ تم نے کبھی اس کے ساتھ لین دین کیا؟ کہنے لگا، جی نہیں! اچھا! تو اس کے ساتھ کبھی سفر کیا؟ کہتا ہے کہ، جی نہیں۔ فرمایا: اچھا! آپ نے اس کو مسجد سے نکلتے دیکھ لیا ہوگا! اس لیے تعریفیں کر رہے ہو۔تو لین دین کر کے پتہ چلتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے!

آج ہمارا یہ حال ہے کہ ایک آدمی کسی مسلمان بھائی کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے، اس کو غریب سمجھ کر اپنے کاروبار میں شریک کر لیتا ہے۔آگے سے وہی اس کی

جڑیں کاٹتا ہے...... کسی نے خیر خواہی کی، کاروبار نہیں چلتا تھا۔ مسلمان بھائی سمجھ کر Credit (ادھار) پر مال دے دیا، وہ دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ جس سے بھلا کرو وہی آگے سے برا ثابت ہوتا ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ ہمارے تربیت نہیں ہوئی۔ ہمیں کسی نے اخلاق سکھائے نہیں۔ یہ نہیں سمجھایا کہ انسانیت کسے کہتے ہیں۔ جب یہ انسانیت آئے گی تو ہمارے اندر خیر خواہی آجائے گی۔ دوسروں کے بارے میں بھلائی آجائے گی۔ پھر ہمارے دین کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کیا کریں گے۔ ہمارے معاملات کو دیکھ کر لوگ اسلام قبول کیا کریں گے۔ آج معاملہ الٹ ہے۔ جب ہماری زبان سے لوگ جھوٹ سنتے ہیں تو پھر سوچیے کہ مسلمانوں کے بارے میں ان کا کیا تصور بنے گا۔

آج کے مسلمان کی ''ان شاء اللہ'':

ایک آدمی مجھے باہر کے ملک میں کہنے لگا کہ جب کوئی مسلمان ان شاء اللہ کہہ دے تو سمجھ لیں کہ اس کا کام کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں حیران ہوا یہ بات سن کر۔ وہ کہنے لگا کہ میں ٹیچنگ کرتا ہوں۔ مسلمانوں میں میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو کام انہوں نے کرنا ہو تو ٹھوس کہتے ہیں کہ جی میں یہ کام کروں گا اور جہاں نیت خراب ہوتی ہے، آگے سے کہتے ہیں، ان شاء اللہ!...... اب بتایئے کہ مسلمانوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے کفار کے تجربہ میں یہ بات آئی کہ جب ان شاء اللہ کہہ دیں گے تو کام نہیں کریں گے۔ تو ہم نے اس اللہ کے نام کی نسبت کو کہاں تک پہنچا دیا۔ اللہ اکبر!

ہم سبب بن رہے ہیں اسلام کی بدنامی کا۔ چونکہ ہم بگڑے ہوئے ہیں اس لیے ہم بگڑے ہوئے کام کرتے ہیں۔ دین کے راستے میں ہم رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ تو ہمیں اپنے اخلاق پر توجہ دینی ہے اور اپنے آپ کو ایک اچھا انسان بنانا ہے۔

صحابہ کرام ؓ میں عیب پوشی:

صحابہ کرام ؓ نے اپنے اخلاق کو بنایا تھا، اس لیے وہ جس طرف رخ کرتے تھے، کامیابیاں ان کے قدم چومتی تھیں۔ صحابہ کرام ؓ کی آپ میں ایسی محبت تھی کہ حیران ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی وہ کس طرح پردہ پوشی فرمایا کرتے تھے۔ اللہ اکبر کبیرا!

ایک مرتبہ صحابہ ؓ بیٹھے تھے، نماز کا وقت قریب تھا۔ اچانک یوں محسوس ہوا کہ کسی کا وضوٹوٹا اور بدبو محسوس ہوئی۔ صاف ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی نہ کوئی اٹھ کر جاتا اور وضو کر کے آتا اور جو محفل سے اٹھ کر جاتا تو سب کے سامنے اس کی سبکی ہوتی۔ ہے تو یہ قدرتی چیز مگر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی اٹھ کر جائے، عبداللہ بن عباس ؓ کھڑے ہوئے اور عرض کی کہ اے اللہ کے نبی ﷺ! اگر اجازت ہو تو ہم سب دوبارہ وضو کر کے نہ آجائیں؟ محبوب ﷺ نے فرمایا: بہت اچھا! سب کے سب صحابہ کرام ؓ گئے اور دوبارہ وضو کر کے آئے تاکہ یہ پتہ نہ چلے کہ کس کا وضو خطا ہوا تھا۔ ایک دوسرے کے عیبوں پر پردے ڈالتے تھے۔ مسلمان بھائی کو شرمندہ نہیں کرتے تھے۔ اللہ اکبر۔

بوقتِ قتل بھی خیر خواہی:

ہمارے اسلاف ایک دوسرے کے لیے قربانی دیتے تھے۔ چنانچہ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گزرے ہیں۔ دوسروں کی خیر خواہی کے بارے میں ان کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ وقت کے بادشاہ نے اپنی مرضی کا کوئی فتویٰ مانگا۔ آپ نے انکار کر دیا اور اس کی مرضی کا فتویٰ نہ دیا۔ فتویٰ وہ دیا جو شریعت کے مطابق تھا۔ ہمارے اکابر کا یہی دستور رہا ہے۔ بادشاہ نے دو اور حضرات سے بھی پہلے فتویٰ

پوچھا تھا۔ ان کی طرف سے بھی ایسا ہی معاملہ ہوا۔ اس کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے حکم دیا کہ تینوں کو گرفتار کر لو! جب بادشاہوں کی مرضی نہیں چلتی تو پھر یونہی ان کا حکم چلتا ہے۔ تینوں حضرات گرفتار ہو گئے۔ بادشاہ نے کہا کہ میں ان کو قتل کراؤں گا اور میں خود سامنے بیٹھوں گا۔ جلاد کو بلا لیا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ سب سے آگے ہیں، ان کے پیچھے دوسرے دو حضرات ہیں۔ بادشاہ کے دل میں ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں عقیدت تھی کہ یہ بزرگ ہیں، نیک ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ باقی دو کو تو میں قتل کرا دوں اور ان کو پھر کسی بہانے سے معاف کر دوں گا لیکن وہ کھڑے سب سے آگے تھے۔ بادشاہ کہنے لگا نہیں! یہ جگہ ٹھیک نہیں۔ ان کو ذرا ادھر لے آؤ۔ مقصد (ترتیب بدلنا) تھا۔ جب ادھر کھڑے کیے گئے تو ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ پھر سب سے آگے۔ پھر اس نے کوئی عذر بنایا کہ نہیں، ان کو ادھر لے آؤ۔ وہاں گئے تو ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ پھر آگے۔ اب بادشاہ نے ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا اور بلا کر بات کھول دی کہ میں تو یہ چاہتا تھا کہ آپ کو معاف کر دوں۔ باقی دو کو تو میں قتل کروانے کے بارے میں Serious (سنجیدہ) تھا۔ آپ تینوں جگہ سب سے آگے کھڑے ہوئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ ابوالحسن رحمۃ اللہ علی ہنے اس کے پوچھنے پر فرمایا کہ میں تینوں جگہ آگے اس لیے کھڑا ہوا کہ آپ نے تو قتل کا حکم دے دیا۔ میں نے سوچا کہ جلاد پہلے مجھے قتل کرے گا اور جتنی دیر مجھے قتل کرنے میں لگے گی، میرے بھائیوں کو اتنی دیر زندہ رہنے کا موقع مل جائے گا۔ ایک وقت تھا کہ ہم اپنے بھائیوں کے بارے میں اتنا فائدہ سوچا کرتے تھے کہ مرتے مرتے بھی دوسروں کا فائدہ سوچتے تھے۔

موت کے وقت خیر خواہی:

جنگ یرموک کا واقعہ اکثر بیان کرتے رہتے ہیں: کہ تین صحابہ ﷺ کا آخری

وقت ہے۔ان میں سے ایک پیاس کی شدت سے پکارتا ہے **العطش**،**العطش** ان کا کزن پانی لے کر جاتا ہے۔یہی الفاظ دوسرے صحابی ﷛ سے سنتے ہیں تو اپنا منہ بند کر لیتے ہیں۔اشارہ کرتے ہیں کہ پہلے اس کے پاس جاؤ!وہاں پانی لے کر جاتے ہیں تو وہ اشارہ کرتے ہیں کہ پہلے تیسرے کے پاس جاؤ!وہ تیسرے کے پاس جاتے ہیں تو وہ شہید ہو چکے ہوتے ہیں۔واپس دوسرے کے پاس آتے ہیں تو وہ بھی شہید ہو چکے ہوتے ہیں اور واپس پہلے صحابی ﷛ کے پاس آتے ہیں تو وہ بھی جامِ شہادت نوش کر چکے ہوتے ہیں۔

وہ حضرات عین سکراتِ موت کے وقت بھی دوسروں کو ترجیح دیتے تھے۔مگر ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ہوش وحواس میں بھی دوسروں کو ترجیح نہیں دیتے۔

درجہ انسانیت معلوم کرنے کا تھرما میٹر:

ہمیں اپنے آپ کا جائزہ لینا ہے......جیسے حرارت معلوم کرنی ہو تو اس کے لیے تھرما میٹر ہوتا ہے۔اسی طرح اگر کسی کو اللہ رب العزت کے قریب معلوم کرنا ہو کہ اللہ تعالیٰ کو وہ کتنا پسند ہے؟اس کو معلوم کرنے کا تھرما میٹر اس بندے کے اخلاق ہیں۔اس کے اخلاق دیکھیے۔جس کے اخلاق اعلیٰ درجے کے ہیں وہ اللہ کا مقرب ہے اور جس کے جتنے اخلاق برے ہیں اتنا وہ اللہ سے بھی دور ہے۔اور اخلاق کا پتہ چلتا ہے ساتھ رہ کر،چل پھر کر کہ کتنا تحمل اور بردباری ہے!کتنا قربانی اور خیر خواہی کا جذبہ ہے!

مسلمانی کو فخر ہے ان پر:

امام اعظم ابوحنیفہ ابتدائے جوانی میں کپڑے کی دکان کرتے تھے۔ایک دن ظہر کے بعد ہی دکان بند کر کے آرہے تھے۔راستے میں کسی دوست کو ملے تو اس نے

پوچھا۔نعمان! اتنی جلدی دکان بند کر دی؟ فرمانے لگے کہ آسمان پر بادل تھے، اس لیے میں نے دکان بند کر دی۔ اس نے حیران ہو کر پوچھا، بھئی بادلوں سے کیا تعلق دکان بند کرنے سے؟ فرمانے لگے کہ بات یہ ہے کہ جب آسمان پر بادل ہوتے ہیں تو اس وقت گاہک کو قیمتی اور ہلکے کپڑے کے درمیان تمیز نہیں ہوتی۔ میں نے دکان بند کر دی تاکہ کوئی ہلکے کپڑے کو قیمتی سمجھ کر نہ لے جائے اور اس کا نقصان نہ ہو جائے۔ سوچیے! کہ کبھی ہم کتنے خیر خواہ تھے دوسروں کے۔ تبھی تو کافر ملکوں سے لوگ آتے تھے مسلمانوں کے پاس کہ آپ ہمارے پاس آئیں اور ہمیں بھی یہ طریقہ زندگی سیکھا دیں۔

کتنے ملک ایسے ہیں کہ جہاں مسلمانوں کی فوج بعد میں پہنچی اور اسلام وہاں پہلے پہنچا۔ خطوط آتے تھے مسلمانوں کی طرف کہ آپ آجایئے اور ہمیں اپنا طرز زندگی بتا دیجیے۔ ہم اس ظلم کی زندگی سے بے زار ہیں۔ یوں اسلام پھیلا۔ تو ہماری زندگی جب شریعت وسنت کے مطابق ہوگی تو ہم سراپا خیر بن جائیں گے۔ اسی لیے فرمایا:

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ

''دین سراسر خیر خواہی ہے۔''

جانوروں کی بھی خیر خواہی:

ہمارے حضرات تو جانوروں کی بھی خیر خواہی کرتے تھے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ نے ایک رات تہجد کی نماز ادا کی۔ سخت سردی تھی۔ سائبیریا کی یخ ہوائیں، تاشقند کے رہنے والے تھے۔ نماز کے بعد ٹھٹھرتے کانپتے آئے کہ لحاف میں جاؤں۔ دیکھا کہ لحاف میں ایک بلی مزے سے سو رہی ہے۔ انہوں نے بلی کو نہ اٹھایا اور ٹھٹھرتے ہوئے مصلے پر بیٹھ کر رات گزار دی۔ اللہ اکبر!

ہمارے اسلاف جانوروں کی بھی خیر خواہی کرتے تھے اور ہم اللہ کے بندوں کی خیر خواہی نہیں کر سکتے!

خیر خواہی جہنم کے لیے آڑ:

خیر خواہی پروردگار کو اتنی اچھی لگتی ہے...... اتنی اچھی لگتی ہے کہ بنی اسرائیل کی زانیہ عورت اگر پیاسے کتے کو پانی پلا دیتی ہے اور کتے کی پیاس دور ہو جاتی ہے، اللہ رب العزت اس فاحشہ عورت کے سب گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔ تو اگر ہم اللہ کے بندوں کو کھلائیں گے، پلائیں گے، پہنائیں گے، ان کا بھلا سوچیں گے۔ ان کو دین سکھائیں گے تاکہ آخرت کا کھانا پینا مل جائے تو اللہ تعالیٰ کتنے خوش ہوں گے! ہم اگر اللہ کے بندوں کو جہنم کی آگ سے بچائیں گے تو اللہ تعالیٰ کتنے خوش ہوں گے۔ اسے کہتے ہیں خیر خواہی اور یہ خیر خواہی ہمیں کرنی ہے۔ یہی مقصود زندگی ہے۔

ہم جہاں رہیں خیر کی علامت بن کر رہیں۔ اچھے اخلاق اسی کو کہتے ہیں اور ایمان کا کمال اچھے اخلاق سے حاصل ہوتا ہے۔

منہ گر یباں پا فقیرا:

آپ کی خدمت میں ایک سبق آموز بات عرض کر کے مضمون کو سمیٹنے کوشش کرتے ہیں۔ بچپن کی بات ہے کہ چھٹی یا ساتویں میں پڑھتے تھے۔ عمر بھی کوئی بارہ تیرہ سال تھی۔ یہ چھوٹی عمر ہوتی ہے، نادانی ناسمجھی کی عمر ہوتی ہے۔

ہمارے سکول میں ایک ساتھی تھا وہ دیہات سے آتا تھا۔ ہم کبھی شہر سے باہر نکلے ہی نہیں تھے۔ ہمیں یہ تک نہیں پتہ تھا کہ گندم درخت پر لگتی ہے یا کسی پودے پر لگتی ہے۔ وہ دیہاتی ساتھی ہمیں جو بات بتاتا ہمارے لیے نئی ہوتی تھی۔

ایک دن اس نے تجویز پیش کی کہ بھئی گرمی کی چھٹیاں آنے والی ہیں۔ آپ

ہمارے ہاں مہمان بنیں، ہم آپ کو دیہات کی سیر کروائیں گے۔ ہم نے گھر آ کر بیان کیا۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا: ٹھیک ہے، تم اچھے بچے ہو، شوق سے پڑھتے ہو، کہنا مانتے ہو۔ میں تمہیں بھائی کے ساتھ بھیجوں گی، وہ تمہیں لے کر جائیں گے اور ایک دو دن وہیں تمہارے ساتھ رہیں گے اور ساتھ لے کر آئیں گے، اکیلے نہیں جانا۔ ہم نے کہا بہت اچھا! چنانچہ بڑے بھائی جان کے ساتھ وہاں گئے اور دو دن رہے۔ ہم نے خوب وہاں قریب قریب کھیتوں کی سیر کی۔ نئی دنیا دیکھی۔ یہ تو تھا Back ground (پس منظر)۔

اصل بات یہ بتانی تھی کہ ہم کھیتوں کی سیر کرتے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ گائے بھینس کا گوبر جمع کیا ہوا ہے۔ گوبر کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ ہم شہر میں رہنے والے تھے، جب پہلی مرتبہ نجاست کا ڈھیر لگا ہوا دیکھا تو حیران ہو گئے۔ ہم نے کہا، عجیب بات ہے! یہاں نجاست کا ڈھیر لگا کر رکھتے ہیں، اتنی بو آتی ہے۔ ہم آگے گزر گئے۔ جب کھیتوں کی سیر کر کے واپس آ رہے تھے تو کیا دیکھا کہ ایک دیہاتی بندہ اس گوبر کو زمین میں ملا رہا تھا۔ اب تو ہمیں اور زیادہ حیرانی ہوئی۔ ہم نے ساتھی سے پوچھا کہ بھئی! یہ نجاست ہے، گندگی ہے، بدبو آتی ہے اور یہ اس کو زمین میں ملائے جا رہا ہے! ساتھی نے کہا کہ اسی سے پوچھو۔ ہم نے اس کسان سے پوچھا کہ چچا جان! یہ بدبودار چیز کیوں ساری زمین میں ملا رہے ہیں؟ وہ آگے سے ہنسا اور کہنے لگا، بچہ! تم شہری ہو، تمہیں پتہ نہیں ہے۔ یہ ہے تو نجاست، لیکن ہمارے تو بڑے کام کی چیز ہے۔ ہم اس گوبر کو اکٹھا کر کے رکھتے ہیں اور جب زمین میں کوئی فصل بونی ہوتی ہے تو پہلے اس گوبر کو زمین میں ملا دیتے ہیں۔ اب یہ سن کر تو ہم اور حیران ہو گئے۔ اچھا! اس نجاست کو اس زمین میں ملا دیتے ہیں، جس میں فصل بونی ہوتی ہے؟ اس نے کہا: بچہ! حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہے تو نجاست لیکن جس کھیت میں اس

کو ملا دیں، یہ وہاں کھاد کا کام کرتی ہے۔اس کھیت کی کھیتی بڑی اچھی ہو جاتی ہے اور اس میں فصل زیادہ ہوتی ہے۔

اس وقت تو ہماری سمجھ میں بات نہ آئی۔ہم حیران ہو کر چل پڑے کہ یا اللہ! یہ کیا معاملہ ہے! لیکن اب بات سمجھ میں آئی ہے۔اب سوچتے ہیں کہ اے انسان! جس چیز کو ہم نجاست کہتے ہیں، گندگی کہتے ہیں، جس میں بد بو ہوتی ہے۔قریب سے گزرنا گوارہ نہیں کرتے۔جوتے پر لگ جائے تو گھن آتی ہے، اسے اتار دیتے ہیں، نفرت کرتے ہیں......ارے اس نجاست کو اگر کھیت میں ڈال دیتے ہیں تو وہ کھیتی کو فائدہ دیتی ہے، کھیتی اچھی ہو جاتی ہے مگر تو انسان ہو کر، اشرف المخلوقات ہو کر اپنے ساتھ رہنے والے دوسرے انسانوں کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا؟ معلوم ہوا کہ تجھ سے تو پھر وہ نجاست اچھی ہے جو اپنے ساتھی کو فائدہ دیتی ہے۔تو اس گندگی سے بھی گیا گزرا ہے۔

واقعی بات ٹھیک ہے کہ ہم اگر اپنے ساتھ رہنے والوں کو دکھ دیں، ان کا دل دکھائیں اور ان کی دل آزاری اور بد خواہی کے درپے ہوں تو پھر یقیناً یہ گوبر اور نجاست ہم سے اچھی ہوئی کہ جو کھیتی کے ساتھ لگ کر اس کو فائدہ دیتی ہے۔ہم ساتھ رہنے والے ساتھی کو فائدہ نہیں دے سکتے۔پھر ہم نجاست سے بھی گئے گزرے ......اور گندگی سے بھی گندے ہیں۔

راحتِ جاں یا وبالِ جاں:

اچھے اخلاق اپنے اندر پیدا کرنا تا کہ اللہ کے بندوں کے لیے راحتِ جاں بن کر رہیں، مگر ہم تو وبال جان بنے ہوئے ہیں۔تو اچھے اخلاق ہم اپنے اندر پیدا کریں اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں اور اپنے او پر محنت کریں۔پھر دیکھیے، اللہ رب العزت کی کیسے رحمت آتی ہے۔اصول یہی سمجھ لیں کہ اگر کوئی ہم سے برائی

بھی کر جائے، لیکن ہم نے اس سے برائی نہیں کرنی۔

حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ حضرت! فلاں آدمی میری بدخواہی کرتا ہے۔ مجھے زچ کرتا ہے۔ میرے راستے میں کانٹے بچھاتا ہے۔ میرا بھی صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا ہے۔ اب میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس سے ٹکا کر بدلہ لوں (کوئی ہم جیسا پہنچ گیا ہوگا نا!)۔ حضرت! بس مجھے اجازت دے دیں، میں ذرا اس کے ساتھ نمٹ لوں۔ حضرت نے اس کو بلایا۔ اللہ والوں کی باتیں بڑی پیاری ہوتی ہیں۔ حضرت نے بڑے پیار سے ایک بات سمجھائی۔ وہ بات سونے کی سیاہی سے لکھنے کے قابل ہے۔ آپ بھی اس بات کو یاد کر لیجیے، زندگی میں کام آئے گی۔ حضرت نے فرمایا:

> ''اے دوست! اگر کوئی تیرے راستے میں کانٹے بچھائے تو آپ اس کے راستے میں کانٹے نہ بچھانا، ورنہ ساری دنیا میں کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے۔''

اللہ رب العزت ہمیں سمجھ عطا فرمائے اور ہم اچھے اخلاق اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہم نیکی کو اپنانے کی کوشش کریں تاکہ ہم دوسروں کے لیے سراپا خیر بن جائیں۔

وَ آخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ﴾ (العنکبوت:۱،۲)

طلبا سے قیمتی باتیں

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہم

اقتباس

جولوگ بھی اللہ رب العزت کے بندے ہیں یعنی کلمہ پڑھنے والے ہیں پروردگار ان کو آزماتے ہیں۔ ہمیں اگر دس روپے کا تربوز لینا ہوتو اسے ٹھونک کر دیکھتے ہیں کہ کچا ہے یا پکا۔ اگر ہم نے مٹی کا پیالہ خریدنا ہوتو جو کہ معمولی قیمت، دو چار روپے کا ہوتا ہے، اسے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کچا ہے یا پکا۔ تو اگر دو چار روپے کی چیز کو بھی قبول کرنے سے پہلے اسے ٹھونک کر دیکھتے ہیں کہ کچی ہے یا پکی۔ پروردگار عالم بھی اسی طرح ایمان والوں کو ذرا ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں کہ کچے ہیں یا پکے۔ ان کو آزماتے ہیں۔ کبھی خوشی دے کر آزماتے ہیں اور کبھی غم دے کر آزماتے ہیں۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

طلباء سے قیمتی باتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْا اَنْ يَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ط
(العنکبوت: ۱، ۲)
سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

دنیا امتحان گاہ ہے:

دنیا دارالفنا ہے، آخرت دارالبقا ہے۔ دنیا دارالغرور ہے، آخرت دارالسرور ہے۔ نبی علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمایا:

اَلدُّنْيَا دَارُ الْمِحَنْ

''دنیا امتحان کی جگہ ہے''

امتحان میں قابل اور نا قابل کا پتہ چلتا ہے۔ فیل اور پاس کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا کی امتحان گاہ میں حق اور باطل کا پتہ چلتا ہے۔ حق کا ساتھ دینے والے کون ہیں اور باطل کا ساتھ دینے والے کون ہیں۔ ''عبادالرحمٰن'' کون ہیں؟ اور ''عبادالشیطٰن'' کون ہیں؟ اسی لیے پروردگار نے فرمایا:

﴿ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ج اِنَّهٗ لَكُمْ

عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴾ (یٰسٓ:۶۰)

''اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا؟ کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کرو گے، بے شک وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔''

﴿ وَاَنِ اعْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴾ (یس:۶۱)

''میری عبادت کرو گے، یہ سیدھا راستہ ہے''

ہم روزانہ کئی مرتبہ دعائیں مانگتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

''اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔''

اب اس ایک دعا کے جواب میں پورے قرآن کی تفصیل ہے:

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ

نہ نفس کی بندگی کرنی ہے، نہ شیطان کی بندگی کرنی ہے، اللہ کی بندگی کرنی ہے۔ یہ بندگی ایک آزمائش ہے، اس سے فرق کا پتہ چلتا ہے کہ کون ماننے والے ہیں اور کون نہیں ماننے والے۔ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو ضرور آزماتے ہیں:

﴿ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ﴾

(العنکبوت:۱،۲)

''کیا سمجھتے ہیں یہ لوگ کہ چھوٹ جائیں گے، صرف یہ کہہ کر کہ ہم ایمان لائے اور یہ آزمائے نہ جائیں گے؟''

کیا شاہانہ انداز ہے! اندازِ تخاطب دیکھیں، کیا عظمت جھلکتی ہے!!

﴿ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ﴾

''میں نے ان سے پہلے والوں کو بھی آزمایا۔''

﴿ فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ﴾ (العنکبوت:۳)

''ہم ضرور بالضرور سچے اور جھوٹے کے درمیان فرق کر کے رہیں گے۔''

یَعْلَمُنَّ ثقیلہ کا صیغہ ہے، تاکید کا آخری درجہ ہے۔

دو قسم کے لوگ:

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے۔ ایک طرف انبیا اور ان کے پیچھے چلنے والوں کی جماعت ہے اور دوسری طرف شیطان اور اس کے پیچھے چلنے والوں کی جماعت ہے۔ ایک جماعت ایمان والی ہے اور دوسری جماعت انکار والی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَّمِنكُمْ مُّؤْمِنٌ﴾ (التغابن:۲)

''وہ ذات جس نے تمہیں پیدا کیا، پس تم میں سے کچھ کافر ہیں اور کچھ مومن''

کچھ ماننے والے ہیں اور کچھ انکاری ہیں

☆ ...... جو مومن ہیں وہ ''اصحاب الجنہ'' اور جو کافر ہیں وہ ''اصحاب النار''۔

☆ ...... مومن ''اصحاب المیمنہ'' اور کافر ''اصحاب المشئَمہ''

☆ ...... یہ ''اصحاب الیمین'' ہیں اور وہ ''اصحاب الشمال''۔

اللہ تعالیٰ آزماتے ہیں:

جو لوگ بھی اللہ رب العزت کے بندے ہیں یعنی کلمہ پڑھنے والے ہیں پروردگار ان کو آزماتے ہیں۔ ہمیں اگر دس روپے کا تربوز لینا ہو تو اسے ٹھونک کر دیکھتے ہیں کہ کچا ہے یا پکا۔ اگر ہم نے مٹی کا پیالہ خریدنا ہو تو جو کہ معمولی قیمت، دو چار روپے کا ہوتا ہے، اسے بھی ہم دیکھتے ہیں کہ کچا ہے یا پکا۔ تو اگر دو چار روپے کی چیز کو بھی قبول کرنے سے پہلے اسے ٹھونک کر دیکھتے ہیں کہ کچی ہے یا پکی۔ پروردگار عالم بھی اسی طرح ایمان والوں کو ذرا ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں کہ کچے ہیں یا پکے۔ ان کو آزماتے ہیں۔ کبھی خوشی دے کر آزماتے ہیں اور کبھی غم دے کر آزماتے ہیں۔ کبھی صحت دے کر

اور کبھی بیماری دے کر۔ کبھی حالات کو موافق کر دیتے ہیں اور کبھی مخالف کر دیتے ہیں۔

حالات کا تغیر:

وہ پروردگار 'مغیر الاحوال' ہیں۔ فرماتے ہیں:

﴿ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ ﴾ (ال عمران:۱۴۰)

''یہ دن ہم انسانوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں''

ایک جیسا وقت ہمیشہ نہیں رہتا۔

☆...... آج خوش ہیں تو کل غم زدہ۔

☆...... آج غم زدہ ہیں تو کل خوشیاں نصیب ہوں گی۔

☆...... کبھی ہاتھ تنگ ہے تو کبھی ہاتھ کھلا۔

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ۝ ﴾ (البقرۃ:۱۰۰)

ترجمہ ''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، کچھ خوف سے، کچھ بھوک سے اور کچھ جان مال اور میوہ جات کی کمی سے اور بشارت دیجیے، صبر کرنے والوں کو''

بشارت اور نذارت ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ مگر بشارت سے پہلے کچھ آزمائشوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ ہر حال میں بندہ آزمایا جا رہا ہے۔

دو جھنڈے:

یہ ایمان والے شرم و حیا کے علم بردار ہیں۔ دین اسلام نے کہا:

اَلْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ

''حیا ایمان کا شعبہ ہے۔''

اس لیے مومن باحیا زندگی گزارتا ہے، پاکدامنی کی زندگی گزارتا ہے۔ جبکہ کافر حیا کو ایک بیماری سمجھتا ہے۔ اس لیے یورپ اور امریکہ میں کہتے ہیں کہ:

Shyness is a sickness.

''کہ شرم وحیا ایک بیماری ہے۔''

یعنی وہاں پر اگر کوئی آدمی شرمیلا ہو، شرم وحیا والا ہوتو وہ کہتے ہیں کہ یہ بیمار ہے، نفسیاتی مریض ہے۔ جتنا وہ بے حیا ہوگا، ان کے نزدیک وہ اتنا ہی جی دار اور روشن خیال ہوگا۔ تو یہ دو نظام ہیں۔ ایک نظام حیا کا جھنڈا اٹھائے چل رہا ہے اور ایک بے حیائی کا جھنڈا اٹھائے چل رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں۔

فائنل نتیجہ:

آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ پوری دنیا میں ملت اسلامیہ ایک طرف ہوتی جارہی ہے اور کافر ''ملت واحدہ'' ایک طرف ہوتے جارہے ہیں۔

اللہ رب العزت بھی نتیجہ نکال رہے ہیں۔ جیسے کسی کام کو سمیٹنا مقصود ہوتا ہے نا! تو پھر اس کام کی سمری بنا لیتے ہیں۔ اچھا بھئی! یہ سارے پھیلے ہوئے کام کو ذرا مختصر کرتے جائیں۔ اب فائنل نتیجہ ہونا ہے۔ اچھا! لسٹیں بنالو کہ فیل کون ہے اور پاس کون ہے۔ اب چونکہ قرب قیامت کا زمانہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ یوں معاملہ فرما رہے ہیں:

﴿ لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ﴾ (الانفال:۳۷)

اللہ تعالیٰ ایسے حالات بنارہے ہیں۔ وہ خبیث اور طیب کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے پوری دنیا کے لوگوں کو جھنجھوڑا گیا۔ کافروں نے برملا پوچھا کہ تم ہمارے ساتھ ہو کہ اوروں کے ساتھ؟ کھل کر بات کرو۔ درمیانی بات کوئی

نہیں۔ ہر بندے کو کھل کے ساتھ دینا پڑا۔ کسی کی ہمدردیاں اور دعائیں ایمان والوں کے ساتھ تھیں اور کسی کی ہمدردیاں کفار کے ساتھ۔ اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے انسانوں کو جھنجھوڑ کر پرکھ کر لی۔

کاروانِ حق:

اہل ایمان کا ایک قافلہ ہے جس میں سب سے اوّل انبیائے کرام کی جماعت ہے اور اس جماعت کے پیچھے ان کے صحابہ ﷺ کی جماعت اور صحابہ کرام ﷺ کے پیچھے علمائے کرام اور اولیائے کرام کی جماعت۔ یہ سب اللہ کی رضا چاہنے والے لوگ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے والے لوگ ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رضا والی منزل کی طرف چل رہے ہیں۔ ان کا مقصد کیا ہے؟

وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ

''یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کی رضا سب سے بڑی چیز ہے''

دنیا میں رہتے ہوئے یہ ہر کام کرتے ہیں مگر اللہ کے لیے۔ ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، کھانا پینا سب اللہ کے لیے ہوتا ہے۔

﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

(الانعام:۱۶۲)

''بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور مرنا سب اللہ پروردگار کے لیے ہے''

یہ ایسی مقدس جماعت ہے کہ جو بھی چھوٹا یا بڑا کام کرتے ہیں، اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی خواہشات کے لیے نہیں، ریاکاری اور دکھاوے کے لیے نہیں، بلکہ صرف اللہ کی رضا کے لیے۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست:

ایک دوسری جماعت ہے جو کافروں کی جماعت ہے، وہ عیش وعشرت میں لگی ہوئی ہے:

''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست''

بابر نے کہا تھا کہ بھئی! تم عیش کرلو، دنیا دوبارہ نہیں آتی۔ کرلو جو مزے کرنے ہیں۔ تو کافر اس دنیا کو اپنی جنت سمجھتے ہوئے ہر کام کرنا چاہتے ہیں اور وہ مسلمانوں کو بھی اس بے حیائی کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ کبھی ٹی وی کے ذریعے، کیبل کے ذریعے، وی سی آر کے ذریعے...... پتہ نہیں کس کس بلا کے ذریعے۔

رب کی رضا کے متلاشی:

یہ ہمارے طلبا...... الحمدللہ! انبیائے کرام کے پیچھے چلنے والی جماعت میں شامل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیوں کو اللہ کے دین کے لیے وقف کر دیا۔ انہوں نے دل ہی دل میں عہد کرلیا کہ ہم نے اللہ رب العزت کی رضا کو حاصل کرنا ہے اور ہم اس جماعت کے پیچھے چلنے والے ہیں، اس میں راحت ملے یا تنگی۔

- ......انہوں نے رسم ورواج کو چھوڑا
- ......انہوں نے انگریز کی تہذیب کو لات ماری
- ......انہوں نے میز کرسیوں کی بجائے چٹائیوں پر بیٹھنا پسند کرلیا
- ......انہوں نے وہاں کی بریانیاں کھانے کی بجائے معمولی روٹی کھانی پسند کرلی

یہ قربانی ہے!...... دین کی خاطر معمولی زندگی کے رہن سہن کو قبول کرلیا۔ یہ بھی ایک قربانی ہے۔

انہوں نے قربانی کو قبول کرلیا اور یہ قربانی دے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ ان طلبا کا

تعلیم میں گزرنا ہے اور پھر اس کے بعد تعلیم و تدریس میں یا وعظ و نصیحت میں، امامت وخطابت میں، افتاء وارشاد میں ان کا وقت گزر جاتا ہے، تو یہ خیر کی طرف بلانے والے لوگ ہیں۔

شیطان کا زوردار حملہ:

آزمائش ہر طرح کی آتی ہے۔خاص طور پر عربی مدارس کے طلباء کے پیچھے تو شیطان ہاتھ دھو کے پڑ جاتا ہے۔اس کو پتہ ہوتا ہے کہ اب یہ میرے ہاتھ سے گئے، یہ اسی طرح چلتے رہے تو منزل پر ضرور پہنچیں گے۔لہٰذا اب لگالو جوزور لگانا ہے۔ان کی توجہ اور کاموں میں لگا کر پڑھائی سے ہٹالو۔

شیطان کی آماجگاہیں:

کہتے ہیں کہ کسی نے شیطان کو فارغ بیٹھے دیکھا۔اس نے اس سے پوچھا: تو تو کبھی فارغ ہوتا ہی نہیں، ہر وقت کام میں لگا رہتا ہے، نہ تجھے کھانا نہ پینا، نہ سونا، ہر وقت کام کرتا ہے۔اب تجھے فارغ بیٹھا دیکھ رہا ہوں، کیوں؟ کہنے لگا: میرے چیلے چانٹے بہت ہو گئے ہیں۔اس نے کہا وہ کیسے؟ شیطان نے کہا کہ یہ جو اتنے سکول کالج بن گئے ہیں! یہ جتنے بھی سکول، کالج ہیں، میرے چیلے چانٹوں سے بھرے پڑے ہیں۔اب اتنے برخوردار ہو گئے ہیں کہ مجھے زیادہ کام کرنے کی ضرورت نہیں۔اب میں گرو بن کے بیٹھ گیا ہوں۔اسی لیے اکبرالہ آبادی نے فرعون کے بارے میں کہا تھا:

یوں قتل سے بچوں کے بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اگر وہ کالج بنوا دیتا تو بنی اسرائیل کے بچوں کو مروانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان جگہوں پر جو جاتا ہے، ان کے ایمان کا گلا ہی گھونٹ کے رکھ دیا

جاتا ہے۔آج کل حالات ایسے بن گئے ہیں، کالج میں قدم رکھتے ہی علمی اعتبار سے فتنہ فساد شروع، شریعت کی بات سننا اور اس میں میم میخ نکالنا، یہ ان کا کام ہوتا ہے۔ یہ ایسے کیوں ہے؟...... وہ ایسے کیوں نہیں؟ ...... جیسے وکیل تبصرہ اور جرح کرتا ہے نا! یہ ایسے جرح کرتے ہیں شریعت کی باتوں پر۔ اور جب یونیورسٹی میں پہنچتے ہیں تو پھر وہاں تو اور ہی زیادہ حساب ہوتا ہے۔

خطرۂ ایمان:

ایمان کا بچانا آج کل کالج یونیورسٹی کے ماحول میں مشکل ہو گیا ہے ...... بہت مشکل ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس ماحول میں کفاری منتہبت زیادہ ہو رہی ہے۔ جس کو دیکھو وہی دنیا داری ...... اور مادہ پرستی میں لگا ہوا ہے۔ ایک طرف تو وہ ادارے ہیں جو مادی زندگی کو خوب انجوائے کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اور دوسری طرف یہ مدارس ہیں کہ جہاں آخرت بنانے کی باتیں ہوتی ہیں۔ نبی علیہ السلام کی مبارک سنتوں کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کی اتباع اور اللہ کی یاد والی زندگی کی باتیں، یہ ہماری اصل بنیاد ہے۔

فنونِ معاش اور علومِ معاد:

جس کو علم کہتے ہیں حقیقت میں وہ یہ علم ہے جو قرآن اور حدیث کے اندر موجود ہے۔ ادھر تو فنون پڑھائے جاتے ہیں۔ کسی کو انجینئر بنا دیا، کسی کو ڈاکٹر بنا دیا، کسی کو کمپیوٹر سائنس سکھا دی۔ وہ تو فنون ہیں، سکھاتے جا رہے ہیں۔

''فنون سے انسان دنیا کی روزی کماتا ہے، ان علوم سے انسان اللہ کی رضا کماتا ہے۔''

اللہ کا انتخاب:

عزیز طلباء! آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ یہاں آ گئے نہیں! اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبول کر لیا۔ آپ خود بتائیں کہ جو بندہ آپ کو ناپسندیدہ ہو، آپ اسے اپنے گھر میں آنے دیتے ہیں! گھر تو کیا گلی سے کوئی نہیں گزرنے دیتا۔ تو اگر آپ اللہ تعالیٰ کو معاذ اللہ! ناپسندیدہ ہوتے تو وہ تمہیں اپنے گھر بلاتا؟ یہ مسجد اور مدرسہ اللہ تعالیٰ کے گھر ہیں۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے، جس میں انہوں نے فرمایا ہے کہ مسجدیں تو اللہ کا گھر ہیں ہی سہی، وہ فرماتے ہیں کہ جن جگہوں پر قرآن پڑھا جاتا ہے، وہ بھی ''بیوت اللہ'' میں شامل ہیں۔ یعنی وہ جگہیں جہاں قرآن پاک کی تدریس ہوتی ہے، وہ جگہیں بھی بیت اللہ میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے گھر میں صرف اپنے دوستوں کو ہی بلاتا ہے۔

شیطان کی بٹالین فوج:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے گھر میں آنے کی توفیق دی اور جب آپ آئے تو شیطان کو پتہ چل گیا کہ یہ اب میری جماعت کو چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ اب وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس بندے کو علم سے محروم کیا جائے۔ اور اس کا طریقہ کیا ہے؟ طلباء کے ذہن میں وسوسے ڈالنا...... ہر وقت وسوسے ڈالنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ میرا یہ محاذ کمزور ہے۔ اس پر مجھے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ جب جرنیل دیکھتا ہے نا! کہ فلاں جگہ پر دشمن کی تعداد زیادہ ہے، تو پھر وہ وہاں اپنے دفاع کے لیے اپنی فوج بھی زیادہ کر دیتا ہے۔ شیطان کو پتہ ہے کہ یہ مدارس میں اللہ والے بن جائیں گے، اہل علم بن جائیں گے، لہٰذا وہ بھی اپنی بٹالین

فوجیں بھیجتا ہے۔

اسی لیے عام بندے کے ساتھ تو ایک شیطان ہوتا ہے، اور پتہ نہیں طالب علم کے ساتھ کتنے شطونگڑے ہوتے ہیں!! یہ تو حدیث میں بھی آ گیا کہ اُمرد کے ساتھ ستر (70) شطونگڑے ہوتے ہیں۔ تو شیطان اور شطونگڑے سب مل کر کوشش کرتے ہیں کہ ان بچوں کو علم سے بے زار کر دو۔

شیطان کے انجیکشن:

چنانچہ نتیجہ کیا ہوتا ہے! وہ یہ کہ طالب علم کو علم کے سوا ہر کام اچھا لگتا ہے۔ پڑھنا مشکل، باقی ہر کام آسان۔ حالانکہ نیت کر کے آئے، گھر والوں کی چاہت سے آئے، ارادہ لے کے آئے، لیکن شیطان ذہن کے اندر Objection (اعتراضات) ڈالتا رہتا ہے...... وساوس...... لہٰذا طالب علم کے لیے سب سے بڑا فتنہ، شیطانی وساوس ہیں۔ ہر وقت بے چارے پریشان ہوتے ہیں۔ شیطان ان پر حملے کرتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ کالجوں، یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں، ان کو وساوس نہیں آتے۔ ان کو تو وسوسے ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں، وہ تو خود بخود وہ کام کر رہے ہوتے ہیں جو شیطان چاہتا ہے۔ وہ خوش ہو کے بیٹھا ہوتا ہے۔ کہتا ہے: Well Done ٹھیک کر رہے ہو! بہت اچھا کر رہے ہو!...... ادھر اس کو خود کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کو پتہ ہے کہ ایک ایک طالب علم جو میرے ہاتھ سے نکل گیا، یہ تو گھر جا کر ہزاروں انسانوں کی ہدایت کا سبب بن جائے گا۔ اپنے چیلوں سے کہتا ہے کہ ادھر توجہ دو۔ ان کو پڑھائی سے ہٹاؤ۔ لہٰذا:

> ’’کامیاب طالب علم وہ ہے جو ہر طرف سے اپنی توجہ **ہٹائے** اور حصولِ علم پر اپنی توجہ جمائے۔‘‘

دن رات اس کام میں لگا ہوا ہو، علم کا نور حاصل کرنے کا شوق ہو، جب ا

جماعت میں بیٹھے تو ہمہ تن متوجہ ہوکر پڑھے، اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔

گناہ اور یادداشت:

ابتدائے جوانی میں انسان کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے، لیکن گناہوں کی وجہ سے پھر وہ چھین لی جاتی ہے۔ اگر نوجوان نیکوکاری اور پرہیزگاری کی زندگی کو اپنائیں تو ان کی یادداشت بہت اچھی رہے گی۔

فوٹوگرافک میموری:

حضرات محدثین کی زندگیوں کو آپ نے پڑھا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے کیسی یادداشت عطا فرمائی تھی! فوٹوگرافک میموری! جو بات ایک دفعہ سن لیتے پھر سالوں نہیں یاد رہتی تھی۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں علم نبوی سے زیادہ محبت شوق رکھنے والے تھے۔ حضرت مفتی محمد شفیع نے اپنی کتاب میں لکھا کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، یہ مولوی قسم کے صحابی تھے۔ ان کا نبی علیہ السلام کی بات اور آپ کے اعمال یاد رکھنے کا شوق تھا۔ مگر شروع شروع میں بھول جاتے تھے۔ غزوہ خیبر کے بعد مسلمان ہوئے، صحبت کا زمانہ بھی تھوڑا پایا، مگر تھوڑے وقت میں اتنا کچھ پایا کہ دوسروں سے اس میدان میں آگے نکل گئے۔ جب بھول جاتے تھے تو ایک دفعہ نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! عمر بھی زیادہ ہوگئی ہے، وقت بھی میرے پاس کم ہے، بھول بھی جاتا ہوں، دعا فرما دیجیے۔ نبی علیہ السلام نے فرمایا: اپنی چادر بچھاؤ! انہوں نے چادر بچھائی۔ تو نبی علیہ السلام نے ایسے کوئی چیز ڈالی جیسے گٹھڑی میں کچھ ڈالتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے چادر لپیٹی اور گٹھڑی بنا کے اٹھالی۔ اس کے بعد نبی علیہ السلام سے سنی ہوئی بات مجھے ایسے یاد ہوتی تھی کہ بھولتی ہی نہیں تھی۔

بے مثال قوتِ حافظہ:

چنانچہ تابعین میں سے ایک حاکم تھا، مروان۔ اسے ایک دفعہ خیال آیا کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بہت احادیث کی روایت کرتے ہیں، آیا یہ روایات من وعن وہی ہیں یا بالمعنیٰ ہیں۔ یعنی ایک یہ ہوتا ہے کہ میں نے آپ کی بات سنی اور اپنے لفظوں میں ہو بہو مفہوم آگے ادا کر دیا۔ اس کو روایت بالمعنیٰ کہتے ہیں، یعنی معنی وہی مگر الفاظ اپنے۔ ایک دوسری صورت ہوتی ہے کہ جو الفاظ سنے من وعن اسی طرح آگے بیان کر دیے۔ یعنی الفاظ بھی وہی اور معنی بھی وہی، اس کو روایت بالمتن کہتے ہیں۔ مروان کے ذہن میں اشکال پیدا ہوا۔ یہ تو اس کو پتہ تھا کہ یہ جو بات کرتے ہیں سچی ہے، اس میں اس کو شبہ نہیں تھا۔ اس کے دل میں اشکال یہ آیا کہ یہ اپنے الفاظ میں مفہوم بیان کرتے ہیں یا واقعی الفاظ بھی وہی اور معنی بھی وہی ہوتا ہے۔ اس نے سوچا، چلو! اس کا پتہ کر لیتے ہیں۔ اب وقت کے بادشاہ کی اپنی ترتیب ہوتی ہے ہر کام کی۔ اس نے ترتیب یہ بنائی کہ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور بہت سارے دوسرے حضرات کو کھانے کی دعوت دی، بہت سارے صحابہ رضی اللہ عنہم اور بھی تھے۔

چنانچہ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بات کہی کہ آپ نبی علیہ السلام کی بہت باتیں سناتے ہیں، ہمیں بھی آج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنائیے۔ ساتھ ہی ایک پردہ تھا اور اس کے پیچھے اس نے دو تیز لکھنے والے کاتب بٹھائے ہوئے تھے اور کسی کو پتہ نہیں تھا کوئی یہاں ہے یا نہیں۔ تو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے سینکڑوں احادیث روایت فرمائیں۔ لمبی محفل تھی۔ جو کچھ وہ کہتے رہے، پردے کے پیچھے دو بندے لکھتے رہے۔ دو بندے اس لیے بٹھائے کہ اگر کوئی غلطی لگے تو دوسرا ٹھیک لکھ لے، آپس میں تقابل بھی کر سکیں۔ لہٰذا پوری محفل کی روداد انہوں نے قلم بند کی۔ کسی کو پتہ ہی نہیں تھا، کانوں کان خبر ہی نہیں۔

اس کے بعد ایک سال گزر گیا۔ایک سال بعد مروان نے دوبارہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو دعوت دی، کھانے پہ بٹھایا۔ وہ جو دو بندے پچھلے سال والے تھے ان کو پھر پردے کے پیچھے بٹھایا اور ان کو سمجھایا کہ میں عرض کروں گا کہ ہمیں پچھلے سال والی حدیثیں سنائیں، اور جب وہ سنائیں تو تم نے جو پچھلے سال کا لکھا ہوا ہے اس کے ساتھ Comparision (موازنہ) کرتے جانا ہے کہ کہاں کہاں فرق پڑتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پچھلے سال کی کئی باتیں اس سال تو یاد نہیں ہوتیں۔ یہ اس نے چیک کرنے کا ایک ڈھنگ، ایک طریقہ نکالا۔ چنانچہ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو اس نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ حضرت! جو پچھلے سال آپ نے حدیثیں سنائیں تھیں نا! وہ بہت اچھی تھیں، بڑا مزہ آیا، بس دل چاہتا ہے کہ وہ محفل دوبارہ تازہ ہو جائے، وہ پھر سنا دیجیے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے وہی حدیثیں سنانا شروع کیں۔ سینکڑوں وہی احادیث اس محفل میں سنائیں۔ کاتب حضرات نے گواہی دی کہ کہیں ایک لفظ کا فرق بھی نہیں تھا۔ یہ قوت حافظہ ان کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔

حافظ یا چھاپہ......!!!:

یہ نعمت اللہ تعالیٰ طلبا کو بھی دیتے ہیں۔ بس اس میں ایک ہی چیز رکاوٹ بنتی ہے اور اسے کہتے ہیں ''گناہ''۔ جو طالب علم تقویٰ اور پرہیز گاری کی زندگی گزارتا ہے، اس کی قوت حافظہ کو اللہ تعالیٰ بہت بہتر کر دیتے ہیں۔ بس ''فوٹو گرافک میموری'' بن جاتی ہے۔ جو کچھ سنتا ہے، اس کی چھاپ لگ جاتی ہے، ایسی یادداشت عطا فرما دیتے ہیں۔ اور یہی چیز حضرات محدثین میں تھی۔

محدّث کی تعریف:

محدّثین کون تھے؟ یہ وہ رجال تھے جن کے دلوں میں نبی علیہ السلام کی محبت کوٹ

کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور قوت حافظہ ان کو اللہ تعالیٰ نے دوسروں سے ممتاز عطا فرمائی تھی۔ اور ان کو ہر وقت نبی علیہ السلام کے اقوال، افعال اور اعمال یاد رکھنے کی فکر رہتی تھی۔ پوری زندگی اسی میں گزر جاتی تھی۔

قوتِ حافظہ کی انوکھی مثال:

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کی قوت حافظہ ایسی تھی کہ لاکھوں حدیثیں ان کو یاد تھیں۔ چنانچہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جب بصرہ تشریف لے گئے تو اہل بصرہ نے ان کا استقبال کیا اور پورے شہر کے لوگ نکل کر باہر آ گئے۔ استقبال کرنے کے بعد انہوں نے آپ کو ایک محفل میں بٹھایا۔ ذرا توجہ سے سننا!

انہوں نے پہلے پلاننگ بنائی کہ یہ حافظ الحدیث ہیں۔ ہم ان کو پرکھیں گے کہ یہ کیسے حافظ ہیں۔ انہوں نے دس بندوں کو تیار کیا اور ہر بندے نے دس احادیث یاد کر لیں، مگر کہیں متن میں اور کہیں سند میں ہر حدیث میں فرق ڈال دیا۔ اچھا! جب کسی کا تعارف کرایا جائے کہ یہ حافظ الحدیث ہیں، اور اس سے کہا جائے کہ حدیث سناؤ، تو اس کا دل تو چاہتا ہے کہ جو مجھے کہا جائے سب آتا ہو۔ پہلے تو ان لوگوں نے اتنے بڑے مجمع میں امام بخاری کا تعارف کرایا کہ جی، بڑے امام ہیں، حافظ ہیں، لاکھوں حدیثیں یاد ہیں، انہوں نے خوب تعریفیں کیں۔ اس کے بعد ایک بندہ کھڑا ہوا کہ جی! مجھے کچھ حدیثیں پہنچی ہیں، ذرا سنیں! آپ کو پہنچی ہیں کہ نہیں؟ چنانچہ اس نے پہلی حدیث پڑھی مگر اس حدیث کی سند میں یا متن میں کہیں فرق تھا۔ اس نے پڑھ کر پوچھا کہ آپ کو یہ حدیث پہنچی ہے؟ امام بخاری نے فرمایا: لَا۔ اب ایک کو تو بندہ کہہ سکتا ہے لا، اس نے دوسری پڑھی، فرمایا: لَا۔ اس نے تیسری پڑھی، فرمایا: لا۔ چوتھی پڑھی، فرمایا: لا۔ اب عام بندہ تو سمجھے گا کہ واہ بھئی واہ! یہ کیسے حافظِ حدیث ہیں! کہ جو

پوچھتے ہیں، آگے سے لا۔ اسے تو کچھ نہیں آتا۔ پھر دوسرے نے پوچھا...... تیسرے نے پوچھا...... دس بندوں نے سو حدیثیں پوچھیں۔ انہوں نے سب کے جواب میں ''لا'' کہا۔ پتہ ہے ان پر کتنا نفسیاتی بوجھ پڑا ہوگا!!! اللہ اکبر۔ بہت بڑا امتحان تھا، مگر وہ ''لا'' کہتے رہے۔

جب سب بندوں کے جواب میں لا کہا تو اس کے بعد امام بخاری نے فرمایا: بھئی دیکھو! آپ حضرات نے جو حدیثیں پوچھی ہیں نا! اب ذرا سنو! تو امام بخاری نے پہلی حدیث پڑھی جو اس بندے نے غلط متن یا سند کے ساتھ پڑھی تھی اور پھر فرمایا کہ اس بندے نے اس حدیث میں یہ غلطی کی ہے۔ پھر فرمایا کہ مجھے یہ حدیث یوں پہنچی ہے۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ امام صاحب نے ان کے غلط متن یا سند کی جو روایت تھیں، سو کی سو اسی ترتیب کے ساتھ پہلے سنائیں اور ساتھ ساتھ ہر حدیث صحیح متن و سند کے ساتھ سناتے گئے۔ علماء فرماتے ہیں کہ سو حدیثوں کو یاد کر لینا یا سنا دینا امام صاحب کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ حیران کن بات تو یہ تھی کہ پوچھنے والوں نے جو خلط ملط کر کے پوچھا تھا، ان سے ایک ہی دفعہ سن کر ان کی بھی سو باتیں یاد رہ گئیں اور ترتیب بھی وہی رکھی۔

پرہیزگاروں کا انعام:

اس سے کیا پتہ چلتا ہے؟ ایسی قوت حافظہ تھی کہ بس دماغ میں فوٹو کھینچ لیتے تھے۔ یہ کب ہوتا ہے؟ جب انسان تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی گزارتا ہے، یہ ایک انعام ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ اسے دیتے ہیں...... قوت حافظہ تیز ہو جاتی ہے، چھاپ لگ جاتی ہے۔ اور جب انسان شیطانی خیالات کا شکار رہتا ہے، بس پھر پڑھی ہوئی باتیں بھی یاد نہیں رہتیں۔

قوت حافظہ اور محدث کا مقام:

ان حضرات کی یادداشت حیران کن حد تک تیز تھی۔ یہاں تک کہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے، ظاہری بینائی چلی گئی تھی۔ ایک دفعہ حرمین شریفین کے سفر پر جا رہے تھے، اونٹ پر سوار تھے۔ اب اونٹ ویسے بھی اونچا ہوتا ہے، اور جو بندہ اونٹ کے اوپر بیٹھا ہوتا ہے، ماشاء اللہ وہ کافی اونچا پچا ہوا ہوتا ہے۔ اگر سڑک کے ادھر ادھر درخت لگے ہوئے ہوں تو ڈر رہتا ہے کہ سر کو نہ لگیں۔ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ اونٹ پر سوار جا رہے تھے کہ ایک جگہ امام صاحب نے سر بالکل نیچے جھکا لیا۔ لوگ بڑے حیران ہوئے، آگے جا کر پھر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ تو پوچھنے والے نے پوچھا؟ حضرت! آپ نے سر ایسے کیوں جھکا لیا؟ فرمانے لگے: وہ جو درخت تھا اس کی شاخوں سے بچنے کے لیے میں نے سر نیچے جھکایا۔ حضرت! یہاں تو درخت کوئی نہیں۔ پوچھنے لگے کوئی نہیں...؟؟؟ حضرت! یہاں تو درخت ہے ہی نہیں۔ فرمانے لگے: رک جاؤ۔ سب رک گئے۔ فرمایا کہ علاقے کے لوگوں سے پتہ کرو کہ یہاں پر پہلے درخت تھا جسے کاٹ دیا گیا یا درخت تھا ہی نہیں۔ خادم نے کہا کہ حضرت! میں پتہ تو کر کے آتا ہوں مگر یہ اتنا بڑا مسئلہ تو کوئی نہیں ہے۔ فرمانے لگے کہ نہیں، مسئلہ ہے۔ اس لیے کہ میری یادداشت مجھے بتاتی ہے کہ یہاں درخت تھا۔ اگر مجھے بھول ہو گئی ہے تو پھر آج کے بعد میں حدیث نقل کرنا بند کر دوں گا۔ کیونکہ میری یادداشت ٹھیک نہیں رہی۔ اس لیے اس کی ابھی پرکھ ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اہل علاقہ سے جب پوچھا گیا تو انہوں نے بتایا کہ درخت تھا، مسافروں کے لیے مشکل ہوتی تھی، ٹہنیاں نیچے آجاتی تھیں۔ ہم نے وہ درخت جڑ سے ہی نکال دیا۔ امام ترمذی نے فرمایا کہ الحمد للہ! میں حدیث کی روایت کو آئندہ جاری رکھوں گا۔ ایسی قوت حافظہ...... اللہ اکبر!...... یہ کیسے ملتی ہے؟ تقویٰ

اور پرہیزگاری سے ملتی ہے۔

کرشماتی قوتِ حافظہ:

اس قسم کے واقعات کتب میں بہت لکھے ہوئے ہیں۔ حیران کن حد تک۔ امام ابوذرعہ کے واقعات بہت کثرت سے لکھے گئے ہیں۔ آپ محدث تھے اور حدیثیں بہت یاد تھیں۔ ان کے زمانہ میں ایک نوجوان کی شادی ہوئی۔ شادی کو ابھی تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ ایک دن وہ درس سننے کے لیے آیا تو اسے دیر تک امام صاحب کا بیان سننے کے لیے بیٹھنا پڑا۔ گھر جاتے ہوئے بہت دیر ہوگئی۔ بیوی انتظار میں تھی۔ اس نے پوچھا آج آپ بہت دیر سے آئے۔ اس نے بتایا کہ میں وہاں درس میں بیٹھا رہا۔ بیوی غصے میں تھی، کہنے لگی تم لیٹ آتے ہو...... روز دیر کر دیتے ہو...... یہ کیا طریقہ بنایا ہوا ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ بات بڑھ گئی اور جھگڑے میں پڑ گئی۔ جب جھگڑا بڑھ گیا تو بیوی کہنے لگی کہ تم نے علم حاصل کرنا ہے! تمہارے استاذ کو تو کچھ آتا نہیں۔ وہ نوجوان اپنے متعلق تو باتیں برداشت کر لیتا مگر جب اس کے استاد کے متعلق بیوی نے یہ بات کر دی تو غصے میں آ کر کہا: اچھا! اگر میرے استاذ کو ایک لاکھ حدیثیں یاد نہ ہوں تو تجھے تین طلاق، چل فارغ...... ! ٹھاہ! ٹھاہ! ٹھاہ!...... اب رات تو گزر گئی، صبح دونوں کے دماغ جب ذرا ٹھنڈے ہوئے تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ بیوی نے کہا: جی مشروط طلاق ہے۔ اب بتائیں کہ اگر تو شرط پوری ہوتی ہے تو طلاق نہیں ہوئی اور اگر شرط پوری نہیں ہوئی تو طلاق ہوگئی۔ نوجوان نے کہا: اچھا! میں پتہ کر کے آتا ہوں، میں خود تو نہیں بتا سکتا۔

چنانچہ وہ اپنے استاذ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی نالائقی کی داستان سنا دی کہ حضرت! مجھ سے یہ گڑبڑ ہوگئی۔ اب آپ بتائیں کہ طلاق واقع ہوئی یا نہیں ہوئی۔ یہ بات سن کر ابوذرعہ مسکرائے اور فرمانے لگے:

''جاؤ میاں بیوی کی طرح زندگی گزارو! اس لیے کہ ایک لاکھ حدیثیں مجھے اس طرح یاد ہیں، جیسے عام لوگوں کو سورۃ فاتحہ یاد ہوتی ہے۔''

دیکھا! یہ تھے ہمارے حضرات، اور ہم ان کے قافلے کے پیچھے چل رہے ہیں۔ آگے آگے وہ ہیں اور پیچھے پیچھے ہم ہیں۔

ایک ہی منزل کے راہی:

عزیز طلبا! ہمیں یہ جوان محدثین کے ساتھ نسبت ہے، یہ بڑی عزت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا انعام ہے کہ اسی راستے پر ہم بھی چل رہے ہیں۔ اگرچہ ان میں اور ہم میں زمین آسمان کا فرق ہے، لیکن منزل ان کی اور ہماری ایک ہی ہے۔

ٹرین چل رہی تھی فرسٹ کلاس کا ائرکنڈیشنڈ، خوبصورت ڈبہ جہاں ختم ہوتا تھا، وہاں تھرڈ کلاس کا ٹوٹا پھوٹا ڈبہ جڑا ہوا تھا۔ فرسٹ کلاس کے ڈبے نے تھرڈ کلاس کے ڈبے سے کہا: میں تو بالکل نیا ہوں، ائرکنڈیشنڈ لگا ہوا...... لائٹنگ بہترین...... قالین بچھے ہوئے...... اور میرے اندر بیٹھنے والے عظیم لوگ ہیں۔ تو کیا بھنگڑ قسم کا میرے ساتھ لگ گیا ہے۔ چلتا ہے تو چوں چوں کی آوازیں آتی ہیں...... تیرے اندر بیٹھنے والے معمولی درجے کے لوگ ہیں...... تیری قیمت بھی معمولی...... زنگ لگا ہوا ہے...... چل میرا پیچھا چھوڑ! تو تھرڈ کلاس کے ڈبے نے کہا: میں نے مان لیا کہ آپ کی شان بڑی اونچی ہے، آپ فرسٹ کلاس کے ہیں اور میں تھرڈ کلاس کا ہوں۔ سب لوگ مجھے کم نظر سے دیکھتے ہیں...... زنگ آلود ہوں...... میری کرسیاں بھی ٹوٹی ہوئی ہیں...... اور سب کچھ جو آپ کہتے ہیں میں اس سے بھی برا ہوں، لیکن ایک بات بڑی پکی ہے۔ اس نے کہا: وہ کیا؟ تھرڈ کلاس ڈبے نے کہا: وہ یہ کہ میری کنڈی تمہاری کنڈی کے ساتھ پھنسی ہوئی ہے۔ اب میاں! جہاں تم جاؤ گے، وہیں میں نے پہنچ جانا

ہے۔ اگر تم کراچی کے اسٹیشن پر پہنچو گے تو ہم بھی کراچی کے اسٹیشن تک پہنچ جائیں گے۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ جب آپ نے دارالعلوم میں داخلہ لے لیا تو آپ نے ان کے قافلے کی ٹرین کے ساتھ کنڈی پھنسا دی۔ اب ہم نالائق بھی ہیں، نااہل بھی ہیں اور کمزور بھی ہیں۔ جو کہا جائے سب ٹھیک ہے، لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ...... الحمدللہ! کنڈی پھنس گئی۔ جس راستے پر وہ قافلہ چل رہا ہے، اسی راستے پر ہم چل رہے ہیں۔

صورت کو حقیقت بنالیں:

اب ضرورت کس بات کی ہے؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ جب ہم نے کنڈی پھنسالی تو پھر ہم اپنے ظاہر اور باطن کو ایک کر کے اچھا بنالیں، تاکہ ان کے ساتھ کچھ مشابہت پکی ہو جائے

تیرے محبوب کی یا رب شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں

ہم سب نے صورت تو بنائی ہوئی ہے۔ ماشاء اللہ! ...... اب اس کو حقیقت بنوانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔

مَنْ طَلَبَ فَقَدْ وَجَدَ

''جو طلب کرتا ہے، وہ پالیتا ہے''

یہ کام آسان ہے۔ اتنا بڑا قدم جب اٹھا دیا، اب اگلا قدم تو چھوٹا ہے۔ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیجیے! دل میں یہ عہد کر لیجیے کہ میں نے کوئی کام شریعت و سنت کے خلاف نہیں کرنا۔ اس لیے کہ یہ بڑے حضرات کے ساتھ نسبت ہے۔ یہ

راستہ ادھر کو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس راستے پر اس بندے کو نہیں چلنے دیتے جن کے اندر منافقت ہوتی ہے۔ وہ نکھیڑا کر دیتے ہیں۔ جیسے کسی دوسرے ملک جا رہے ہوں تو ائر پورٹ پر چیک کرنے والے کاغذات دیکھتے ہیں۔ اگر کسی کے کاغذات ٹھیک نہ ہوں تو کہتے ہیں کہ جاؤ بھئی! تم ادھر اور ٹھیک کاغذات والے آگے جاؤ۔ تو ایسا نہ ہو کہ جب ہمارا نامہ اعمال اوپر پہنچے تو کہہ دیا جائے کہ غلط کاغذات والے اُدھر اور دوسرے اِدھر جاؤ۔

اس لیے یہ ڈرنے والی بات ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ طرزِ زندگی اختیار کرنے کی توفیق بخش دی۔ تو اب اس کو صورت نہ رہنے دیں بلکہ حقیقت میں بدلنے کی کوشش کریں۔

احبّاءِ رسول:

مگر یہ سودا ہے بڑا! وہ عظیم حضرات ہیں، عظیم ہستیاں ہیں، جن کے پیچھے پیچھے ہم چل رہے ہیں۔

ایک مرتبہ نبی علیہ السلام دعا مانگ رہے تھے۔ یا اللہ! مجھے میرے ''احباء'' سے جلدی ملا دے۔ جو مجھ سے محبت کرتے ہیں، ان سے جلدی ملا دینا۔ نبی علیہ السلام کے خادم حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ یہ سن کر عرض کرنے لگے، اے اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ کے عاشق صادق ہیں۔ تو وہ کون ہیں جن کے بارے میں آپ بیٹھے دعائیں مانگ رہے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: ثوبان تم عاشقِ صادق ہو، اس لیے کہ تم نے مجھے دیکھا ہے، میری محفل پائی ہے، قرآن اترتے دیکھا ہے، میرا دیدار کیا ہے۔ ثوبان! میرے بعد کچھ لوگ آئیں گے، جنہوں نے مجھے نہیں دیکھا ہوگا۔ وہ فقط کتابوں میں میرے تذکرے پڑھیں گے۔ اپنے اساتذہ سے میری باتیں سنیں

گے۔ وہ میرے بارے میں غائبانہ پڑھ کر اور سن کر، ان کے دل میں ایسی محبت پیدا ہو جائے گی کہ وہ میری ہر سنت کو پورا کریں گے، میری اتباع کریں گے۔ اور اگر ان کے بس میں ہوتا کہ اپنی اولادوں کو بیچ کر میری زیارت کر سکتے تو وہ کر گزرتے۔ ایسی محبت ہو گی۔ ثوبان! میں اپنے ان چاہنے والوں کے لیے دعا کر رہا ہوں۔ اللہ! ان چاہنے والوں کو جلدی ملا دے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس جماعت میں شامل فرما دے۔

کانٹوں کی سیج!!

یہ ایک قافلہ ہے جو حق والوں کے پیچھے چل رہا ہے، اہلِ حق کے پیچھے چل رہا ہے، یہ اہل حق والوں کا قافلہ ہے۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے۔ اب اس راستہ میں تنگی تو آئے گی۔ مشکلات تو آئیں گی۔ کبھی کوئی مشکل اور کبھی کوئی تکلیف۔ ان تکالیف سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ خیر فرمائیں گے۔ ان شاء اللہ۔ مقصد نصیب ہو جائے گا۔ مطلوب حاصل ہو جائے گا۔

رب لئی تج کرنا پیندا اے آسائشاں نوں آراماں نوں

ہمارے کچھ دوست تو شاید نہیں سمجھ رہے ہوں گے! کیوں جی! اب کیا کریں! ان کی انگلش بنائیں کیسے۔ کچھ پشتو والے بھی ہیں!

زبانِ یارِ من پشتو و من پشتو نمی دانم

(حضرت والا یہ باتیں فرماتے ہوئے بہت ہنستے مسکراتے رہے اور محفل کشت زعفران بنی رہی)

رب لئی تج کرنا پیندا اے آسائشاں نوں آراماں نوں
کنڈیاں تے چلنا پیندا اے گل بدناں نوں گل فاماں نوں

یہ تو کانٹوں کی سیج ہے، اس پر چلنا پڑتا ہے، گل بدن ہوں یا گل فام ہوں، چل

نہیں رہے......؟ دیکھ نہیں رہے؟...... کہاں کہاں کی نعمتیں چھوڑ کر آئے بیٹھے ہیں۔ جہاں دنیا جانے کے خواب دیکھتی ہے، مقامی لوگ بیچارے ترلے لیتے پھرتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں، وظیفہ بتا دو جی! کہ ویزا لگ جائے، ہم وہاں پہنچ جائیں۔ جب کہ وہاں پیدا ہونے والے، وہاں پرورش پانے والے۔ ماشاء اللہ! اس حق کی تلاش میں، اللہ نے ان کو ان جگہوں پر بھیج دیا، بوریے پر آ کر بیٹھ گئے، قالینوں کو چھوڑ دیا۔ ابراھیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کی یادیں آج بھی تازہ ہو رہی ہیں۔

نسبت کا حق:

یہ اہلِ حق کا قافلہ ہے......خوب سمجھیے!! یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے حُر کی یاد تازہ کر دی۔ کیونکہ یہ باطل کو چھوڑ کر اہلِ حق کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر بھی بڑا ملتا ہے۔ تو بھئی! ہم اب اس جماعت میں شامل ہیں، لہٰذا ہم نے دوستی کا حق نبھانا ہے۔ دین کو پانا بھی ہے، اس پر عمل بھی کرنا ہے اور اس کو آگے بھی پہنچانا ہے۔ ہمیں تین کام کرنے ہیں

☆......پڑھنا ہے،

☆......پھر کیا؟ عمل بھی کرنا ہے،

☆......پھر کیا؟ کام! آگے بھی پہنچانا ہے۔

تینوں کام کرنے ہیں۔

کہتے ہیں کہ ابراہیم خلیل اللہ کو آگ میں ڈالا گیا تھا، تو ایک چڑیا تھی، وہ اوپر آ کر چونچ سے پانی ڈال کر جاتی تھی۔ تو کسی نے اس چڑیا سے پوچھا کہ تمہارے اس قطرہ پانی سے کیا بنے گا؟ اس سے آگ تو نہیں بجھے گی۔ اس نے کہا کہ یہ تو مجھے بھی پتہ ہے کہ آگ نہیں بجھے گی، مگر میں نے بھی ابراہیم خلیل اللہ کی دوستی کا حق نبھانا ہے نا! جو میں کر سکتی ہوں وہ کر رہی ہوں۔ تو بھئی! جو ہم کر سکتے ہیں وہ ہم کریں۔

اپنی سلطنت:

اس وقت ہر طرف ہی فتنے فساد کا زمانہ ہے، تو ہمارے بس میں تو نہیں کہ ہم اس سارے نظام کو خود ٹھیک کر سکیں، لیکن جس حد تک ہمارا اختیار ہے اپنے آپ پر اس کو استعمال کرتے ہوئے، اس جسم کی سلطنت پر اللہ کا قانون لاگو کریں۔

اس چھ فٹ کے جسم پر تو اللہ نے ہمیں اختیار دیا ہے نا! اس کو ہم اللہ تعالیٰ کی رضا مطابق بنا کر دکھائیں، پھر دیکھیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اللہ رب العزت کی طرف سے پھر مہربانی ہوگی اور ان شاء اللہ قبولیت ہوگی۔

دودھ اور پانی کا دلچسپ مکالمہ:

چند دن پہلے ایک صاحب نے عجیب سی بات سنائی۔ اچھی لگی، آپ لوگوں کو بھی سنا دیتے ہیں۔ کہنے لگے کہ حلوائی دودھ کو آگ پر گرم کر کے جب اس کی ملائی بناتے ہیں تو پہلے اس میں پانی ڈالتے ہیں۔ حلوائی لوگ جو کڑاہی میں دودھ ڈال کر گرم کرتے ہیں، وہ فقط دودھ نہیں ہوتا بلکہ اس میں پانی بھی ملاتے ہیں، کیونکہ وہ پک کر خشک ہوتا ہے اور ملائی بن جاتی ہے۔ وہ عالم فرمانے لگے کہ جب حلوائی دودھ میں پانی ڈالنے لگا تو پانی اور دودھ کے درمیان مکالمہ ہوا۔

دودھ نے کہا: جناب! میرا رنگ بھی گورا، سفید چٹا! میری قیمت بھی اعلیٰ، میرا ذائقہ بھی بہترین، میرے اندر غذائیت بھی بہت زیادہ ہے۔ اے پانی! تیرے اندر تو ان میں سے کوئی چیز بھی نہیں۔ نہ تیری شکل ہے، نہ تیری قیمت، نہ تیرا ذائقہ ہے۔ تو کیوں مجھ میں شامل ہو رہا ہے؟ میرے اور تیرے درمیان بڑا فرق ہے، میں اعلیٰ ہوں، تو ادنیٰ ہے۔ میرا تیرا کیا جوڑ؟ بھئی!

پانی نے کہا: دودھ صاحب! بات آپ کی بالکل ٹھیک ہے، آپ اعلیٰ، آپ کی

قیمت اعلیٰ، آپ کے طلب گار زیادہ لوگ ہیں۔ آپ کی قیمت بھی بہت ہے اور آپ کی غذائیت بھی بہت ہے اور میں کم قیمت ہوں، میری شکل دیکھنے میں اتنی اچھی نہیں، ذائقہ بھی کوئی نہیں، میں ادنیٰ ہوں اور آپ اعلیٰ۔ لیکن مجھے اپنے اندر شامل ہونے دیں اس لیے کہ میں وفادار ہوں، میں اگر آپ میں شامل ہوا تو وفا کروں گا۔

دودھ نے کہا: اچھا! آپ میں وفا بڑی ہے۔ بھئی! ذرا بتاؤ تو سہی کہ وہ وفا کیسے ہوگی؟

پانی نے کہا: جناب! وفا ایسی کہ جب آپ کو آگ پر رکھ کر گرم کریں گے تو جب تک میرا آخری قطرہ پہلے بھاپ نہیں بن جاتا، میں اس وقت تک آپ کو آنچ نہیں آنے دوں گا۔

(جب دودھ میں پانی ڈال کر آگ پر پکاتے ہیں تو پہلے پانی اڑتا ہے، بعد میں دودھ کی باری آتی ہے۔)

تو پانی نے کہا: جناب! میرے میں وفا ایسی کہ پہلے میں آگ کی غذا بنوں گا، اور جب تک میں موجود رہوں گا، اس وقت تک آپ بھاپ نہیں بن سکتے۔ اس لیے مجھے ملنے دیجیے۔

دودھ نے کہا: اچھا! پھر آؤ، مجھے گلے ملو، تم اتنے وفادار ہو! مگر ایک بات میری بھی سن لو! جب تم نے مجھے گلے لگانے کی کوشش کی وفا کے ساتھ، تو پھر ایک بات ذہن نشین رکھو کہ جس قیمت پر میں بکا کروں گا، قیمت تمہاری بھی وہی لگے گی۔

اکابر دودھ ہیں اور ہم پانی:

بھئی! بات ایسی ہی ہے، ہمارے اکابر دودھ تھے اور ہم پانی ہیں، لیکن ہم ان کے گلے لگنا چاہتے ہیں، ہم ان کے قدموں میں پڑنا چاہتے ہیں، مگر ان کے قدموں میں پڑتے ہوئے ہمیں قربانی دینا پڑے گی، نفس و شیطان کے خلاف جنگ کرنا پڑے گی۔ اگر ہم نے گناہوں کی آگ سے بچنے والی جنگ کر لی تو اللہ کا وعدہ یہی ہے:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّہ

''آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اس کو محبت ہوگی''

ان شاء اللہ! قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جیسے ان علما،فقہا اور محدثین کا درجہ فرمائیں گے، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ ہم عاجز مسکینوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ فرمائیں گے۔

وَمَاذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ (فاطر:۱۷)

''اور اللہ کے لیے کوئی کام مشکل نہیں۔''

تمنائے فقیر:

دعا اور تمنا یہ ہے کہ آپ حضرات کا یہاں آنا اور ان حضرات کی نگرانی میں یہاں پڑھنا، اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں۔ اس عاجز مسکین کی دعائیں آپ سب کے ساتھ ہر وقت شاملِ حال رہیں گی۔ آپ خوب دل لگا کر پڑھیے، تاکہ جو مقصد لے کر آئے ہیں وہ پورا ہو۔ اساتذہ الحمد للہ محنتی ہیں اور آپس میں محبت رکھنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا نصیب فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

﴿ اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَھْدِیْ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ﴾

جذب وسلوک کی تجلیات

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی دامت برکاتہم

بمقام: جامع مسجد مدینہ جھنگ صدر

بتاریخ: 16 اکتوبر 2004 برموقع: سالانہ نقشبندی اجتماع

اقتباس

یہ دونوں طرح کے لوگ الگ الگ تجلیات کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں کبھی ایک طرح کی تجلیات پہلے پڑتی ہیں اور کبھی دوسری طرح کی تجلیات پہلے پڑتی ہیں۔ چنانچہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے تھے جو پہلے مجذوب بنے.... کیا مطلب؟...... کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے خود ان کو اپنی طرف کھینچا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور وہ کھنچے، تو کھنچنے کے بعد وہ خود بھی اپنی محبت اور شوق کے ساتھ آگے بڑھنے لگ گئے۔ جیسے نبی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے محبوب بھی ہیں اور محب بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی یاد میں روتے تھے۔

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

جذب وسلوک کی تجلیات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○
﴿ اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴾
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

راہِ عشق کے راہی:

راہِ عشق پر چلنے والے دوطرح کے ہوتے ہیں:۔

(۱)...... وہ لوگ جو اپنی محنت اور ریاضت سے محبوبِ حقیقی کا وصل چاہتے ہیں، مشقتیں اٹھاتے ہیں، تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، قربانیاں دیتے ہیں، ہر دکھ اور سکھ کو گلے لگاتے ہیں۔ ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے محبوب کا وصل حاصل ہو جائے۔ اس وصل کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی زندگی کو مقصد پر قربان کر دیتے ہیں۔...... نہ انہیں آرام کی پروا...... نہ انہیں آسائش کی پروا...... وہ ہر وقت فکر مند ہوتے ہیں کہ ہمارا محبوب کیسے راضی ہو جائے۔ مجھے محبوب کی نگاہوں میں کیسے قرب حاصل ہو جائے۔ مجھے میرے محبوب کا وصل کیسے حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے وہ دن اور رات کو ایک کر دیتے ہیں، جی بھر کے عبادت کرتے ہیں، نفسانی خواہشات کو توڑتے ہیں، اپنے نفس کو مشقتوں کی چکی میں سے گزارتے ہیں اور ریاضت کی اس بھٹی میں

جل کر کندن بن جاتے ہیں اور پھر ان پر اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت ہو جاتی ہے۔ایسے لوگوں کو عاشق کہتے ہیں، مرید کہتے ہیں، سالک کہتے ہیں۔

(۲)...... کچھ ایسے خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جن سے محبوب وصل چاہتا ہے۔ محبوب خود چاہتا ہے کہ یہ میرے قریب ہو جائیں اور یہ میرے چاہنے والے بن جائیں۔محبوب خود ان کوا

پنے قریب کر لیتا ہے۔ان کو مراد کہتے ہیں اور انہیں تصوف کی زبان میں ''مجذوب '' کہتے ہیں۔

......مجذوب سے مراد وہ لوگ نہیں جو گلیوں میں آدھے ننگے پھر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے تو ان کو بھی مجذوب ہی ہیں، لیکن ان کا معاملہ کچھ اور ہوتا ہے۔

جو مجذوب ہم کہہ رہے ہیں اس سے مراد وہ بندہ ہے جس میں جذب ہو، کشش ہو، محبوب اسے چاہے، محبوب اسے قریب کرے، محبوب اسے اپنے وصل کا موقع خود عطا کرے۔ان کو مراد اور مجذوب کہتے ہیں۔

ایسے لوگوں پر جذب کی تجلیات پڑتی ہیں۔ان کے لیے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں۔مثلاً:

......اسباق کرنے آسان

......کیفیات بڑی اچھی

......تہجد کی پابندی میں کوئی مشکل نہیں ہوتی

......دین کے کسی کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی

......ماحول بھی بڑا اسازگار ہوتا ہے

......ہمت بھی بلند ہوتی ہے، اور

......خوب ذوق وشوق کے ساتھ وہ اس راستے پر لگے ہوتے ہیں۔

یوں لگتا ہے کہ ان کو کوئی چیز کھینچے چلی جا رہی ہوتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ جیسے مجھے کوئی چیز اس راستے پر دھکیلتی چلی جا رہی ہے۔ یوں سمجھیں جیسے سمندر کی لہریں بندے کو دھکیل کر اندر لے جاتی ہیں۔ یہ بھی محبت کے سمندر میں لہروں کے ہاتھوں دھکیلا جاتا ہے اور بالآخر اندر پہنچ جاتا ہے۔ یا جیسے آندھی تیز چل رہی ہو اور آندھی ہی کی سمت کوئی آدمی قدم اٹھائے تو وہ ایسے چلتا ہے جیسے اس کے صرف پنجے ہی لگ رہے ہیں اور وہ تیزی سے چلتا چلا جا رہا ہے، ہوا اس کو پیچھے سے دھکیل رہی ہوتی ہے۔ یہ کیفیت مجذوب کی ہوتی ہے کہ جس کو محبوب چاہتے ہیں کہ یہ میرے قریب ہو جائے۔ یہ میرا دیوانہ بن جائے۔ یہ بھی میرے چاہنے والوں میں شامل ہو جائے۔

ایک اور مثال سمجھیے۔ دوست دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک دوست وہ جو بندے کو ملنے آنا چاہتا ہے۔ اس کو تو بندہ راستہ بتا دیتا ہے۔ بھئی! اگر آپ ملنے آنا چاہتے ہیں تو بس یا ویگن یا ٹیکسی کے ذریعے فلاں جگہ پر میرے مکان پر آ جائیں۔ اس کی مثال سالک کی سی ہے جسے چل کے آنا پڑ رہا ہے۔ اور کئی مرتبہ ایسے ہوتا ہے کہ انسان کو کوئی بچپن کا دوست ملا۔ وہ بڑا گہرا دوست تھا۔ سالوں کے بعد ملا۔ اس سے مل کر اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بندہ کہتا ہے: آؤ یار! گھر چلیں، میرے ساتھ ایک کپ چائے ہی پی لیں۔ اس کو آدمی خود پکڑ کے اپنے گھر لے آتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال مجذوب کی مانند ہے۔

مجذوب کو تو لائے وہ ہمراہ بزم میں
اور سالکوں کو دور سے رستے بتا دیے

اسی بات کو سمجھنے کے لیے سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال کو سامنے رکھیے...... حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے عاشق تھے، محب تھے۔ ان کے دل کی چاہت تھی کہ میں اللہ تعالیٰ کا دیدار کروں، اس کا وصل پا لوں۔ جبکہ نبی علیہ السلام اللہ

تعالیٰ کے محبوب تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملاقات کے لیے کوہِ طور پر جانا پڑتا تھا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا ﴾

''اور جب آئے موسیٰ علیہ السلام ہماری ملاقات کی خاطر۔''

جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ آیا تو ان کو جانا نہیں پڑا، بلکہ فرشتہ بھیج کر ان کو بلوالیا گیا۔ ان کو لے جایا گیا۔ چنانچہ معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی ﴾

''پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گیا رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک''

تو جانا اور بات ہے اور لے جانا اور بات ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام خود کوہِ طور پر گئے اور نبی علیہ السلام لے جائے گئے۔ جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا اور فرمایا: جاؤ! میرے محبوب علیہ السلام کو لے کر آؤ...... سواری کا بھی بندوبست ہے، راستے کا بھی پتہ ہے...... ان کو ملاقات کے لیے بلایا جارہا ہے۔ اب ان دونوں میں فرق کا اندازہ لگائیے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معلاملہ پیش آیا تو ان کو دعا مانگنی پڑی:

﴿ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ﴾

''اے میرے پروردگار! میرے سینے کو کھول دیجیے اور میرے کام کو آسان کر دیجیے۔''

اور جب نبی علیہ السلام کا تذکرہ آیا تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ ﴾

''(اے میرے محبوب!) کیا ہم نے آپ کے سینے کو نہیں کھول دیا''

یہ دونوں طرح کے لوگ الگ الگ تجلیات کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ انسان کی زندگی میں کبھی ایک طرح کی تجلیات پہلے پڑتی ہیں اور کبھی دوسری طرح کی تجلیات پہلے پڑتی ہیں۔ چنانچہ دنیا میں کچھ لوگ ایسے تھے جو پہلے مجذوب بنے...... کیا مطلب؟...... کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے خود ان کو اپنی طرف کھینچا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور وہ کھنچے، تو کھنچنے کے بعد وہ خود بھی اپنی محبت اور شوق کے ساتھ آگے بڑھنے لگ گئے۔ جیسے نبی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے محبوب بھی ہیں اور محبّ بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی یاد میں روتے تھے۔

دیدارِ الٰہی کی تڑپ:

سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی علیہ السلام میرے پاس تشریف لائے اور میرے بستر پر سو گئے۔ اچانک میں نے اپنے چہرے پر گرم گرم چیز لگتی محسوس کی۔ میں اٹھ بیٹھی کہ میرے چہرے پر کیا چیز ہے۔ جب دیکھا تو نبی علیہ السلام کی مبارک آنکھوں سے آنسو رواں دواں تھے اور وہ آنسو میرے رخسار پر گرے تھے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا:

مَا يُبْكِيكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم

''اے اللہ کے رسول! آپ کیوں رو رہے ہیں؟''

تو نبی علیہ السلام نے فرمایا: حفصہ! تم سن نہیں رہی ہو۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے غور کیا تو میرے بھائی عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ صحن میں کھڑے تہجد پڑھ رہے تھے اور تہجد کی نماز میں تلاوت کرتے ہوئے اس آیت کو بار بار دہرا رہے تھے:

﴿ كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ﴾

یہ آیت کافروں کے بارے میں ہے کہ قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ سے حجاب میں ہوں گے اور ان کو اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب نہیں ہوگا۔ نبی علیہ السلام نے جب یہ آیت سنی کہ قیامت کے دن ایسے بھی لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کا دیدار نہیں کر پائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت یوں دل میں موجزن ہوئی کہ آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

سیدہ حفصہ ؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے نبی ﷺ! میں سن رہی ہوں کہ میرے بھائی عبداللہ بار بار یہ آیت پڑھ رہے ہیں:

﴿ كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ﴾

نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: حفصہ!

"أَنَا مُشْتَاقٌ وَبِي اِشْتِيَاقٌ"

"میں مشتاق ہوں اور میرے اندر شوق بڑھ گیا ہے (کہ مجھے اپنے رب کا دیدار نصیب ہوگا)"

اللہ کے محبوب ﷺ خود بھی اداس ہوتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا جلدی وصل نصیب ہو۔ نبی علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے محبوب بھی تھے۔ محبوب ایسے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب سے محبت تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے کی قسمیں کھائیں۔ قرآن مجید میں ان کی مبارک آنکھوں کا تذکرہ کیا۔ ان کے بولنے کا تذکرہ کیا۔ ان کے شہر کا تذکرہ کیا۔ ان کے قلب مبارک کا تذکرہ کیا۔ گویا قرآن مجید میں جا بجا اپنے محبوب کے تذکرے فرمائے۔

حسین، ناز ضرور دکھاتا ہے:

انسان پر کبھی کبھی ابتدا میں سلوک کا وقت گزرتا ہے کہ بندہ اپنے شوق سے آگے

بڑھ رہا ہوتا ہے۔ بڑھتے بڑھتے پھر ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوکر اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو شروع شروع میں اچھے احوال دے دیتے ہیں، اچھی اچھی کیفیات دے دیتے ہیں اور وہ سلوک کے راستے پر تیز چلتا ہے اور پھر ایک جگہ جا کر وہ کیفیات تھوڑی دیر کے لیے روک لیتے ہیں۔اب کہتے ہیں: ذرا چل کے آگے آؤ۔ وہ دیکھنا بھی تو چاہتے ہیں نا، کہ خود اس کو بھی ہماری طلب ہے یا نہیں۔ دیکھیں! جس کو اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے وہ ناز دکھاتا ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ناز دکھاتے ضرور ہیں کہ ہاں! ہم نے تجھے اپنا جلوہ دکھا دیا، محبت کی لذت چکھا دی، اب اگلا رستہ ذرا خود طے کر کے آؤ۔تو سالک کو کبھی اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے اور کبھی اِس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔

جذب کی تجلیات پانے والے:

بہت سارے اولیا ایسے گزرے ہیں جن پر ابتدا میں جذب کی تجلیات پڑیں اور وہ بہت تیزی کے ساتھ اللہ کی طرف کھنچے۔ ویسے تو ایسے بے شمار لوگ ہیں، تاہم چند مثالیں آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ جب ان کی عمر سولہ سال کی تھی انہوں نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ رب العزت کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آئیں گے اور آپ ان کے وزیر بنیں گے اور ان کے خلیفہ بنیں گے۔ایک راہب سے انہوں نے اس خواب کی تعبیر پوچھی تو اس نے بھی کھول کر بتا دیا۔صدیق اکبر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے۔

جب نبی علیہ السلام نے نبوت کا دعویٰ فرمایا تو اس وقت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا

کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اظہار فرما دیا ہے۔ اب ان کو خواب بھی یاد تھا اور راہب کی بتائی ہوئی تعبیر بھی یاد تھی کہ،

تَکُوْنُ وَزِیْرَہٗ فِیْ حَیَاتِہٖ وَ خَلِیْفَتَہ بَعدَوَفَاتِہٖ

لیکن

فَاَسَرَّھَا اَبو بَکْرٌ مِنَ الْکَائِنَاتِ کُلِّھَا

ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ہر کسی سے یہ خواب چھپایا (کسی کو بھی نہ بتایا)

نبوت کے دعوے کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نبی علیہ السلام سے پوچھا:

یَا مُحَمَّد! مَا الدَّلِیلُ عَلیٰ مَا تَدَّعِی

''اے محمد! آپ جس چیز کا دعویٰ کرتے ہیں اس کی دلیل کیا ہے؟''

نبی علیہ السلام نے جواب میں ارشاد فرمایا:

اَلرُّؤیَا الَّتِیْ رَاَیْتَ بِا الشَّامِ

''(اس کی دلیل) وہی خواب ہے جو آپ نے ملک شام میں جا کر دیکھا تھا۔''

یہ سن کر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تڑپ اٹھے

فَعَانَقَہٗ وَ قَبَّلَ مَا بَیْنَ عَیْنَیْہِ

''انہوں نے نبی علیہ السلام سے معانقہ کیا اور نبی علیہ السلام کی پیشانی پر بوسہ دیا (اور آپ پر ایمان لے آئے)''

اب دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے کو پسند کیا تو سولہ سال کی عمر میں پہلے ہی سے دل میں بات ڈال دی۔ پہلے ہی سے ذہن سازی کر دی تا کہ ان کے سامنے اعلان نبوت ہو اور یہ کھنچے کھنچے ان کی طرف آ جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ خود چاہتے تھے کہ میرا یہ مقبول بندہ میرے قریب ہو جائے۔

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی اسی طرح کا معاملہ پیش آیا۔ نبی علیہ السلام ان کے بارے میں دعائیں کرتے تھے: یا اللہ! یا تو عمر بن خطاب کو ایمان لانے کی توفیق عطا فرما، یا عمر بن ہشام کو ایمان لانے کی توفیق عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام کی دعا کو قبول کر لیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے۔

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان لے آئے تو اس پر ایمان والوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ سب کے سب لوگ خوش ہوئے۔ بلکہ حدیث پاک میں آیا ہے کہ پھر جبرئیل علیہ السلام نبی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے محبوب:

اِستَبْشَرَ اَھلُ السَّمَاءِ بِاِسْلَامِ عُمَرَ

''عمر کے اسلام لانے پر آسمان کے فرشتے بھی خوش ہو گئے''

دیکھو! یہ جذب کی تجلیات ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے ایمان لانے کے بعد یہ آیت اتاری۔

﴿ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴾

حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ:

اس امت میں ایک بزرگ گزرے ہیں جن کا نام بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ تھا۔۔۔۔۔۔ حافی کہتے ہیں، ننگے پاؤں چلنے والے کو۔۔۔۔۔۔ وہ ابتدا میں غفلت کی زندگی گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ آدھے نشے میں اور آدھے ہوش میں جا رہے تھے۔ راستے میں انہوں نے ایک کاغذ پڑا دیکھا جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا تھا۔ جب انہوں نے کاغذ پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا دیکھا تو ان کو یہ بات بوجھل لگی کہ اللہ کا نام اس کاغذ پر

لکھا ہوا ہے اور یہ زمین پر پڑا ہے۔ چنانچہ وہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے وہ نام والا کاغذ اٹھا کر اوپر کسی جگہ پر رکھ دیا۔ جیسے ہی انہوں نے نام اونچی جگہ پر رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے ایک ولی کو الہام فرمایا:

''جاؤ! بشر حافی سے کہہ دو کہ تم نے میرے نام کو فرش سے اٹھا کر سر کے اوپر بلند کیا، میں تمہارے نام کو فرش سے اٹھا کر عرش تک بلند کر دوں گا۔''

گویا فرمایا: تم نے تو اتنا اونچا کیا جتنا تم کر سکتے تھے اور میں پروردگار تمہارا نام اتنا اونچا کروں گا جتنا میں کر سکتا ہوں۔ بس! اس کے بعد ان کی زندگی بدل گئی۔ پھر انہوں نے ایسی اولیا والی زندگی گزاری کہ وہ وقت کے بہت بڑے شیخ بنے۔ ہر وقت بڑے بڑے علما ان کی صحبت سے فیض پاتے تھے۔

ایک آدمی بشر حافی کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ایک دن وہ اپنے گدھے پر سوار ہو کر جا رہا تھا۔ گدھے نے راستے میں لید کر دی۔ یہ دیکھ کر گدھے کا مالک رونے لگا۔ کسی نے پوچھا: بھئی! رو کیوں رہے ہو؟ کہنے لگا: میں رو اس لیے رہا ہوں کہ میرا دل کہہ رہا ہے کہ بشر حافی فوت ہو گئے ہیں۔ انہوں نے گدھے والے سے پوچھا: تمہیں کیسے پتہ چلا کہ بشر حافی فوت ہو گئے ہیں؟ گدھے والے نے کہا: میں نے ایک چیز نوٹ کی تھی کہ یہ اللہ کا نیک بندہ ننگے پاؤں زمین پر چلتا تھا، میرے گدھے نے جب بھی پیشاب یا لید کرنی ہوتی تھی وہ ہمیشہ سڑک کے کنارے پر جا کر پیشاب اور لید کرتا تھا، راستے کے درمیان میں نہیں کرتا تھا کہ کہیں اللہ کے اس نیک بندے کے پاؤں نہ ناپاک ہو جائیں۔ آج میرے گدھے نے راستے کے درمیان میں لید کر دی تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ بندہ دنیا سے چلا گیا ہے جس کی وجہ سے میرا گدھا بھی احتیاط کرتا تھا۔ چنانچہ جب پتا کیا تو واقعی لوگ ان کو نہلانے کفنانے کا بندوبست کر رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی قدر دانی دیکھیے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی زمین پر ننگے پاؤں چلنے کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے بھی دلوں میں ڈال دیا کہ راستے میں گندگی نہ پھیلاؤ، ایسا نہ ہو کہ نجاست میرے مقبول بندے کے پاؤں پر لگ جائے۔

کسی نے خود حضرت بشر حافی سے پوچھا: جی! آپ ننگے پاؤں کیوں چلتے ہیں؟...... اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے...... وہ جواب میں کہنے لگے: جب میں نے سچی توبہ کی اس وقت میرے پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔ میں نے قرآن مجید میں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿ وَجَعَلْنَا الْأَرْضَ فِرَاشًا ﴾

''اور ہم نے زمین کو فرش بنایا۔''

اب جس زمین کو شہنشاہِ حقیقی نے فرش بنایا اس فرش پر جوتے کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے حیا آتی ہے۔ میں اللہ کے بنائے ہوئے فرش پر جوتے کے ساتھ کیسے چلوں۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا۔ یہ وہ برگزیدہ ہستی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کھینچا، جن کے لیے محبوب نے اپنی طرف آنے کا راستہ ہموار کر دیا۔

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ بلخ کے بادشاہ تھے۔ ان کی زندگی بڑی شاہانہ تھی۔ لیکن کبھی کبھی چاہتے تھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کا وصل بھی حاصل ہو جائے۔ ان کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔

ایک دن گھر میں سوئے ہوئے تھے۔ ان کو ایسے محسوس ہوا جیسے چھت کے اوپر کوئی چل رہا ہے۔ وہ بڑے گھبرائے کہ میرے محل کی چھت پر کون چل رہا ہے۔ چنانچہ کمرے سے باہر نکل کر پکار کر کہا: ارے! تم کون ہو؟ جواب آیا: میں تمہارا

دوست ہوں۔ انہوں نے پوچھا: تم کیا کر رہے ہو؟ تو جواب آیا: میں اپنا اونٹ تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ یہ سن کر بڑے حیران ہوئے کہ رات کے وقت میں یہ بادشاہ کے محل کی چھت پر اونٹ تلاش کر رہا ہے۔ بادشاہ نے اونچی آواز میں کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم رات کے وقت بادشاہ کے محل کی چھت پر اونٹ تلاش کرتے پھر رہے ہو؟ جیسے ہی انہوں نے یہ بات کی تو جواب آیا: یہ اتنی حیران کن بات نہیں، حیران کن بات تو یہ ہے کہ اس ناز و نعمت کی زندگی میں رہتے ہوئے تم اللہ کو تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ بھئی! رات کے وقت محل کی چھت پر اونٹ کو ڈھونڈنا اتنی حیران کن بات نہیں ہے، حیران کن بات یہ ہے کہ تم اس ناز اور نخرے کی زندگی میں ہو اور پھر کہتے ہو کہ مجھے اللہ کا وصل بھی مل جائے۔

یہ سن کر دل پر فوراً چوٹ لگی۔ دل نے بتا دیا کہ مجھے واقعی اس کے لیے کچھ نہ کچھ قربان کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد ایک اور واقعہ پیش آ گیا...... اس زمانے میں فوم کے گدے بھی نہیں ہوتے تھے اور روم فریشنر بھی نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا جب بادشاہوں کے بستر بنائے جاتے تھے تو عام طور پر اس کے اردگرد دونوں سائڈوں پر پھول رکھ دیے جاتے تھے۔ اسے پھولوں کی سیج کہا جاتا تھا۔ اس سے کمرہ مہک جاتا تھا۔ ادھر کروٹ بدلتے تو ادھر پھولوں کی خوشبو اور ادھر کروٹ بدلتے تھے تو ادھر پھولوں کی خوشبو۔

ایک دن ان کے گھر کی کسی خادمہ نے وہ بستر بنایا۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ میں ذرا دیکھوں تو سہی کہ یہ بستر کیسا ہے۔ چنانچہ وہ جیسے ہی بستر پر لیٹی اسے نیند آ گئی...... بعض اوقات کام کر کر کے بندے کی یہ حالت ہو چکی ہوتی ہے کہ بندے کو پتہ نہیں چلتا کہ میں نے سرہانے پر سر پہلے رکھا تھا یا مجھے نیند پہلے آئی تھی۔ اجتماع میں بھی پہلے ایک دو دن تو رات کو خوب جاگتے ہیں لیکن جب تیسرا دن

آتا ہے تو یہی حالت ہوتی ہے۔ دل کہہ رہا ہوتا ہے کہ آج تو حضرت صاحب ذرا مختصر تقریر کریں تاکہ ہمیں ذرا سونے کا موقع مل جائے۔ بعض سالکین تو کہتے ہیں: حضرت! بس کچھ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ نیند آجانے سے ان کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جاتی ہے۔ یہ ایسی مزے کی بیماری ہے کہ چار گھنٹے سونے کا موقع مل جائے تو ہشاش بشاش ہو جاتے ہیں اور بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ بہر حال یہ انسان کی ایک ضرورت ہے۔...... تو اس باندی کو نیند آ گئی۔

جب ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کمرے میں گئے اور اس نوکرانی کو بستر پر لیٹے دیکھا تو انہیں بڑا غصہ آیا کہ اس کی کیا مجال کہ بادشاہ کے بستر پر سوئے۔ چنانچہ انہوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا اور اسے دو چار تھپڑ لگائے۔ جب تھپڑ لگائے تو وہ روئی، مگر چپ جلدی ہو گئی۔ بادشاہ کو محسوس ہوا کہ میں نے اس کو مارا تو زیادہ ہے لیکن یہ اتنا روئی نہیں، جلدی چپ ہو گئی ہے، بلکہ ہنسنے لگ گئی، آخر وجہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں روئی تو اس لیے ہوں کہ آپ نے مجھے تھپڑ لگایا اور مجھے درد ہوئی۔ پھر پوچھا: ہنسی کیوں؟ کہنے لگی: میں ہنسی اس بات پر کہ مجھے خیال آیا کہ میں اس بستر پر چند منٹ کے لیے سوئی ہوں اور مجھے اتنی سزا ملی ہے، آپ تو ساری زندگی اس پر سوئے ہیں، پتہ نہیں قیامت کے دن آپ کا کیا حال ہوگا!؟۔ باندی تو یہ کہہ کر چلی گئی، لیکن ان کے دل کی دنیا کے تار چھیڑ گئی۔ اب ان کو رات کو نیند نہ آئی۔ اپنی آخرت اور عاقبت کے بارے میں سوچتے رہے۔

اس سے اگلے دن تیسرا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کو بدل دیا۔ دربار میں بیٹھے ہوئے تھے اور دربار مصاحبین سے بھرا ہوا تھا۔ اچانک ایک خوبصورت نوجوان دربار میں داخل ہوا اور وہ چلتے چلتے سیدھا ان کے تخت کے قریب آ کے کھڑا ہو گیا۔ ان کو بڑا غصہ آیا کہ یہ کون ہے جو سیدھا چلتا آیا اور میرے تخت تک پہنچ گیا؟

بادشاہ نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ تمہیں پتہ نہیں کہ تم کہاں آئے ہو؟

نوجوان نے جواب دیا: میں سرائے میں آیا ہوں۔ میں ہوٹل میں آیا ہوں۔

بادشاہ نے پوچھا: وہ کیسے؟ یہ تو میرا محل ہے اور میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔

نوجوان نے جواب میں کہا: بادشاہ سلامت! آپ سے پہلے یہاں کون تھے؟

بادشاہ نے کہا: میرے والد۔

پھر پوچھا: ان سے پہلے کون تھے؟

بادشاہ نے کہا: ان کے والد۔

پھر پوچھا: ان سے پہلے کون تھے۔

بادشاہ نے کہا: ان کے والد۔

نوجوان نے کہا: بادشاہ سلامت! اسی کو سرائے کہتے ہیں کہ ایک آتا ہے، وہ کچھ دیر قیام کر کے چلا جاتا ہے، پھر دوسرے کی باری آتی ہے، جب وہ بھی چلا جاتا ہے تو پھر تیسرے کی باری آتی ہے، اب آپ کی باری ہے کچھ عرصے کے بعد کسی اور کی باری ہوگی۔

اس نے یہ کہا اور باہر نکل گیا۔ بس! اس بات سے دل پر چوٹ پڑی اور فیصلہ کر لیا کہ مجھے اب اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے محنت اور مشقت برداشت کرنی پڑے گی۔ چنانچہ انہوں نے تخت و تاج چھوڑا اور ایک ایسے شہر میں گئے جہاں علما تھے۔ وہاں ان سے علم حاصل کیا اور اللہ تعالیٰ کے بہت ہی مقرب اولیا میں سے بنے۔

اب دیکھیے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کھینچنے کے اسباب خود بنا دیے۔

جب محبوب خود کسی کو مسکرا کے دیکھے تو وہ تو دل ہی دے بیٹھتا ہے اور ساری زندگی کے لیے محبوب کا غلام بن جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بسا اوقات سالک کے حلق میں اپنی شراب الست کے چند قطرے ٹپکا دیتے ہیں تو بندے کو بڑی اچھی

کیفیات ملتی ہیں اور انسان اللہ تعالیٰ کی طرف چلنا شروع کر دیتا ہے۔ مگر ساری زندگی تو ایسی کیفیات نہیں ہوتیں...... گاہے گاہے...... گاہے گاہے...... کیونکہ نبی علیہ السلام نے بھی ایک صحابیؓ سے کہا تھا کہ اگر ساری زندگی تمہاری وہی کیفیت رہے جو میرے پاس بیٹھے ہوئے ہوتی ہے تو پھر فرشتے راستہ چلتے ہوئے تمہارے ساتھ مصافحہ کرنے لگ جائیں۔

حضرت مبارک رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے والد مبارک ایک باغ میں کام کرتے تھے۔ باغ کے مالک نے ان سے کہا: پھل لے آؤ۔ وہ ایک درخت کے پھل توڑ کر لائے، وہ کھٹے تھے۔ پھر دوسرے درخت سے توڑ کر لائے، وہ بھی کھٹے تھے۔ پھر تیسرے درخت سے لے آئے، وہ بھی کھٹے تھے۔ باغ کے مالک نے کہا: تجھے اتنے سالوں میں یہ پہچان بھی نہیں ہوئی کہ کس درخت کا پھل میٹھا ہے اور کس کا کھٹا ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جناب! آپ نے مجھے باغ کی نگرانی کے لیے رکھا تھا، کھانے کی اجازت تو نہیں دی تھی۔ چنانچہ اتنے سالوں میں میں نے کوئی پھل چکھ کر بھی نہیں دیکھا کہ یہ کھٹا ہے کہ میٹھا ہے۔ یہ سن کر باغ کے مالک نے ان کو آزاد کر دیا اور ان کا اپنی بیٹی سے نکاح کر کے اس باغ کا مالک بنا دیا۔ تو یہ مبارک باغ کے مالک بن گئے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ:

پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک بیٹا دیا۔ انہوں نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔ اللہ تعالیٰ کی شان کہ وہ بچہ بڑا ہی خوب صورت تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا۔ یوں ناز و انداز میں پیدا ہوا۔ جب بھرپور جوانی کی عمر کو پہنچا اس کی بھی

غفلت کی زندگی تھی......گانا بجانا، پینا پلانا......ایسی اس کی زندگی تھی۔

ایک مرتبہ انہوں نے اپنے دوستوں کی دعوت کی۔ باغ کے اندر ہی بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔شراب پینے پلانے کا دور چل رہا تھا۔اچانک ان کے کان میں قرآن مجید کی آیت کی آواز پڑ گئی۔ وہ ایسی دل میں اتر گئی کہ انہوں نے اسی وقت اپنی زندگی کو بدلنے کی نیت کر لی۔ پھر جب زندگی بدل لی تو اس کے بعد انہوں نے پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے بالآخر وقت کے ایک بہت بڑے محدث بن گئے۔ اتنے بڑے محدث بنے کہ ایک مرتبہ ان کی حدیث کی کلاس میں وہ دواتیں گنی گئیں، جن سے طلبا حدیثیں لکھتے تھے، تو ان دواتوں کی تعداد چالیس ہزار نکلی......لوگ کتنے ہوں گے!!؟ یہ حدیث سناتے تھے اور ان سے حدیث سن کر لوگ آگے دوسروں تک آواز پہنچاتے تھے۔ جب ان مکبر لوگوں کی تعداد کو گنا گیا تو ان کی تعداد بارہ سو تھی۔ آپ خود بتائیں جہاں بارہ سو سپیکر لگے ہوں وہاں مجمع کتنا بڑا ہوگا!!؟

ایک مرتبہ یہ جامع مسجد میں آئے۔ راستے میں ان کو چھینک آ گئی۔ انہوں نے الحمدللہ کہا۔ تو ان کے پیچھے جتنے طلبا تھے ان سب نے جواب میں یَرحَمُکَ اللّٰہ کہا۔ اس سے اتنی آواز پیدا ہوئی کہ ہارون الرشید بادشاہ نے سمجھا کہ شاید کوئی بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا ہے۔ جب اس کی بیوی نے پتہ کروایا اور اس کو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ ایسے ہوا ہے تو اس نے اپنے خاوند سے کہا:

”یوں تو دنیا آپ کو بادشاہ کہتی ہے، لیکن تمہاری خاطر تو اتنے لوگ کبھی بھی اکٹھے نہیں ہوتے، کہ وہ تمہاری چھینک کا اس طرح جواب دے سکیں۔“

اس وقت کے لوگ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے اتنے معتقد تھے۔

ابتدا میں تو اللہ تعالیٰ نے خوب ان کو اپنی طرف کھینچا اور بعد میں خود ان کو آگے چلنا پڑا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت بہت کثرت کے ساتھ کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ سے

بہت ڈرتے تھے۔

انہی کے بارے میں آتا ہے کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو اس وقت انہوں نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ مجھے چارپائی سے اٹھا کر نیچے لٹا دو۔ شاگردوں نے حضرت کے حکم پر عمل تو کیا، مگر وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ جیسے ہی انہوں نے ان کو اٹھا کر زمین پر لٹایا تو عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ زمین پر اپنا رخسار رگڑنے لگے اور اپنی داڑھی کو پکڑ کر کہنے لگے: ''اے اللہ! عبداللہ کے بڑھاپے پر رحم فرما'' یہ نہیں کہا کہ میں بہت بڑا محدث ہوں، میں بڑا استاد ہوں، میں شب زندہ دار ہوں، میں نیکوکار ہوں، میں اتنے لوگوں تک حدیث کا نور پہنچا چکا ہوں۔ نہیں، اپنا کوئی بھی عمل اللہ کے حضور پیش نہیں کیا۔ بس اتنی بات کہی: ''اے اللہ! عبداللہ کے بڑھاپے پر رحم فرما دے۔''

دوگنا ترقی کا وقت:

یہ جذب کی تجلیات ہوتی ہیں جو بندے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ میرا بندہ مجاہدہ کرے۔ اب ہوتا کیا ہے؟...... کہ کچھ لوگ بیعت ہوتے ہیں۔ شروع میں ان کی بڑی اعلیٰ کیفیات ہوتی ہیں۔ ایسے جیسے موٹر وے پر بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے ان کو اللہ تعالیٰ بڑھاتے رہتے ہیں۔ پھر ایک مقام ایسا آتا ہے کہ جہاں پر اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں کہ اب میرا بندہ کچھ خود بھی آگے چل کے دکھائے، اس وقت وہ پہلے والی لذت اور کیفیت نہیں رہتی، تو وہ لوگ اس کو قبض کی کیفیت سمجھ کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ مایوس ہونے کا وقت نہیں ہوتا، وہ تو ڈبل ترقی کرنیکا وقت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت مبارکہ یہی ہے کہ وہ ہر بندے کو آزماتے ہیں۔

﴿ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُ اللّٰهِ ﴾

ایک ایسا پوائنٹ آتا ہے کہ جہاں جا کر بندہ محسوس کرتا ہے کہ

﴿ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴾

ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں سلوک کے میدان میں کبھی بھی کوئی ایسی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ بھئی! یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ بندے کے اختیار میں تو نہیں ہوتا۔ ہاں ہمارے امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اتنا لکھا ہے:

''اگر بسط میں سالک کی ترقی ایک گنا ہوتی ہے تو قبض کی حالت میں سالک کی ترقی دو گنا ہوتی ہے۔''

جب بھی ایسی کوئی کیفیت ہو وہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے۔ اس لیے چاہیے کہ ایسے وقت میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگا کریں۔ جب آدمی دیکھے کہ میں جو کر سکتا تھا کر لیا، میری کیفیت نہیں سنور رہی تو وہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کچھ وقت کے لیے اسی حال میں رکھنا چاہتے ہیں۔

گر یہ غم نہ ہوتے تو خوشیاں انسان کو سلا دیتیں۔ غافل بنا دیتیں۔ یہ غم انسان کو جگائے رکھتے ہیں۔ اسی لیے تو کہنے والے نے کہا:

سُکھ دُکھاں توں دیواں وار
دکھاں آن ملائیم یار

میں سکھوں کو دکھوں پر قربان کر دوں کہ دکھوں نے مجھے میرے یار سے ملا دیا۔

دل ٹوٹنے پر روحانی پرواز:

جب انسان کا دل ٹوٹتا ہے اور دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ پھر انسان کی ترقی جلدی

ہوتی ہے ؎

تو چھپا چھپا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَنَا عِنْدَ مُنْكَسِرَةِ الْقُلُوْبِ

''میں ٹوٹے ہوئے دلوں میں ہوتا ہوں۔''

جس نے مجھے ڈھونڈنا ہو وہ ٹوٹے ہوئے دلوں میں ڈھونڈے۔

ایک دلچسپ واقعہ:

ایک بزرگ کا واقعہ ہے۔ وہ خود بھی نیک تھے اور ان کی بیوی بھی نیک تھی۔ نیکی کرتے کرتے ان کی عمر گزر گئی۔ بڑھاپے کی عمر آ گئی۔ ایک دن ان کی بیوی صاحبہ نے ان سے کہا: دیکھیں! میں اتنا درود شریف پڑھتی ہوں، لیکن مجھے نبی علیہ السلام کا دیدار کبھی نہیں ہوا۔ آپ کوئی ایسا عمل بتائیں کہ مجھے دیدار ہو جائے۔ انہوں نے جواب دیا: میں آپ کو عمل تو بتا دیتا ہوں، پھر آپ کو وہ عمل کرنا پڑے گا۔ وہ نیک اور بھولی بھالی سی بندی تھی لہٰذا وہ کہنے لگی: جی کروں گی۔ وہ کہنے لگے: پھر آج ذرا دلہن بن کر بیٹھو۔ دلہن والے کپڑے پہنو، زیورات پہن کر بن سنور کر بیٹھو۔ جیسے نئی نویلی دلہن ہوتی ہے ایسے سج دھج کے بیٹھو۔ وہ سمجھی کہ واقعی اس میں کوئی ایسا عمل ہوگا۔ چنانچہ وہ بڑھیا نہا دھو کر، گوٹے کناری والے کپڑے پہن کر اور خوب میک اپ وغیرہ کر کے بیٹھ گئی۔

جب بالکل دلہن کی طرح بن ٹھن کے بیٹھ گئی تو وہ بزرگ اس کے بھائی کے گھر گئے اور اس کو کہنے لگے: میری عمر بھی دیکھ لے، اپنی بہن کی عمر بھی دیکھ لے اور آ کر اس کا حال بھی دیکھ لے۔ بھائی اسی وقت ان کے گھر آیا کہ کیا معاملہ ہوا ہے۔ جب اس

نے گھر میں آ کر دیکھا تو اس کی بہن چمک دمک والے کپڑے پہن کر دلہن بنی بیٹھی ہے۔

جب بھائی نے دیکھا تو اسے بڑا غصہ آیا اور اس نے اسے ٹکا کے ڈانٹا کہ تجھے شرم نہیں آتی، پچھتر سال تیری عمر ہے اور اس عمر میں تیرے یہ چال چلن ہیں۔ وہ بے چاری بہت شرمندہ ہوئی اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب بھائی تو ڈانٹ ڈپٹ کر کے چلا گیا مگر اس سے اس کا اتنا دل ٹوٹا کہ رو رو کر بالآخر سو گئی۔ اللہ کی شان دیکھیں کہ اس نیند کے اندر اس کو نبی علیہ السلام کی زیارت نصیب ہو گئی۔

نبی علیہ السلام کی زیارت کی وجہ سے اسے خوشی تو بہت ہوئی لیکن وہ اس بات سے بہت دکھی تھی کہ میرے بھائی نے کیوں ڈانٹا اور اسے بتایا کس نے؟ جب پتا کیا تو معلوم ہوا کہ خاوند نے بتایا ہے۔ تو وہ کہنے لگی: جی! آپ نے ہی تو کہا تھا کہ یوں تیار ہو کے بیٹھنا، آپ نے میرے بھائی کو جا کر کیوں بتایا۔ وہ کہنے لگے: اللہ کی بندی! میں نے تجھے اپنے گھر میں اتنی محبت سے رکھا، اتنے پیار سے رکھا کہ میں نے کبھی تمہارا دل دکھنے نہیں دیا، جتنی مرضی عبادت کر لیتی، کچھ نعمتیں ایسی ہوتی ہیں جو دکھی دل والوں کو دی جاتی ہیں، تمہیں کبھی کوئی ایسا دکھ نہیں پہنچا تھا، میں نے بہانہ بنایا، کوئی طریقہ تو ایسا ہو کہ تمہارا دل بھی دکھے تاکہ تم پر اللہ کی خاص رحمت اتر آئے، اس لیے میں نے تجھ سے کہا کہ سج دھج کے بیٹھو، پھر تمہارے بھائی کو اطلاع دی، خیال تھا کہ وہ تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کرے گا۔ پھر ایسا ہوا کہ تمہارا بھائی آیا، اس کے آنے کی وجہ سے تمہارا دل ٹوٹا، جس کی وجہ سے اللہ کی رحمت آ گئی اور اللہ نے تمہاری مراد کو پورا فرما دیا۔

شیخ کی طرف سے رہنمائی:

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب کبھی انسان کا دل ٹوٹتا ہے، یا حالات ایسے آ جاتے

ہیں، یا کوئی مصیبت آجاتی ہے تو وہ گھبرانے کا وقت نہیں ہوتا، بلکہ دعائیں مانگنے کا وقت ہوتا ہے۔اس وقت بندے کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔

......کبھی اولاد کی وجہ سے غمزدہ

......کبھی صحت کی وجہ سے غمزدہ

......کبھی بیوی کی وجہ سے غمزدہ

......کبھی کاروبار کی وجہ سے غمزدہ

عام طور پر شیطان دیکھتا ہے کہ یہ چونکہ قبولیت دعا کا وقت ہے اس لیے وہ بندے کے اندر مایوسی پیدا کر دیتا ہے۔جس کی وجہ سے بندہ سارا کچھ چھوڑ چھاڑ کے ایک طرف ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور کہتا ہے: جی! اب تو کچھ نہیں ہوتا۔

پھر اس جگہ پر جن کا رابطہ شیخ مضبوط ہوتا ہے ان کو شیخ بتاتے ہیں: بھئی! گھبرانے والی بات نہیں ہے بس یہ قدرت کی طرف سے بس حالات ہیں،اس چکی میں تجھے پیسا جا رہا ہے، جیسے ہی پس کے نکلو گے تو دیکھو گے کہ پھر تمہیں اللہ کی طرف سے کتنا انعام مل جائے گا ۔

تو چھپا چھپا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

جب دل ٹوٹتا ہے تو پھر اللہ کی نظر میں بہت عزیز تر بن جایا کرتا ہے۔پھر بندے کے اوپر اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں ہوتی ہیں۔مگر اس کو صرف صاحبِ نسبت سمجھتے ہیں اور وہ بتاتے ہیں کہ نہیں نہیں، آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

طلب کی پرکھ:

سالک جب اس راستے پر قدم اٹھاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت

ہوتی ہے تو وہ شروع میں تو کئی مرتبہ کھینچ لیا جاتا ہے۔مگر کچھ وقت اس کو چلنے کا بھی موقع دیا جاتا ہے کہ اتنا سفر تو ہم تمہیں اٹھا کر لے آئے ،جلدی طے کروا دیا،اب ذرا خود بھی کچھ کر کے دکھاؤ۔تمہارے اندر طلب بھی ہے یا نہیں۔اس لیے کہ ہمیں اپنے حسن و جمال پہ اتنا ناز ہے کہ ہم بے طلبوں کی پروا نہیں کیا کرتے۔جو ہمارے حسن کو جانتے ہوئے بھی ہم سے بے طلب ہو کر بیٹھیں ،ہم اس کی پروانہیں کیا کرتے۔اب تم ذرا چل کے آؤ اور دکھاؤ کہ تم بھی ہمیں چاہتے ہو۔ہم نے تمہارے لیے

......اتنا راستہ کھول دیا

......گُر بھی بتا دیا

......تمہیں شوق بھی عطا کر دیا

......تمہیں ہم نے اپنے حسن کی تجلی بھی دکھا دی

اب تم بھی چند قدم آگے آ کر تو دکھاؤ

میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے
انہی پتھروں پہ چل کے اگر آ سکو تو آؤ

ذکر وسلوک کے راستے میں انسان پر مختلف حالات آتے ہیں۔

نبیِ رحمت کا اضطراب:

اللہ رب العزت نے اپنے محبوب ﷺ پر کئی مرتبہ وحی کو تھوڑے عرصے کے لیے روک لیا۔اللہ تعالیٰ کے محبوب ﷺ پر یہ بات اتنی بھاری تھی کہ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔حتیٰ کہ ایک کیفیت ایسی بھی بنی کہ آپ ﷺ کا جی چاہتا تھا: کاش! میں پہاڑ کے اوپر سے اپنے آپ کو نیچے گرا دوں ،اس لیے کہ لوگوں نے بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب تو تمہارے پروردگار نے بھی تم کو چھوڑ دیا ہے۔

پریشانی کی تلافی:

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہوتے ہیں۔ان کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔کوئی بھی ایسا بوجھ نہیں ڈالتے جو وہ نہ اٹھا سکتا ہو۔

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾

''اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ہمت سے زیادہ مکلّف نہیں کرتے''

اس لیے اگر اس راستے میں اس طرح کی کیفیت آئے تو بدل ہو کر سب کچھ چھوڑ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ ہمت سے کام لیکر، رجوع الی اللہ کرنے کی اور اللہ سے مانگنے کی عادت بنائی جائے۔کیونکہ وہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خاص نعمت ملنے کا وقت ہوتا ہے۔اس وقت میں جو لوگ رجوع الی اللہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ان کی امیدوں سے بڑھ کر عطا کرتا ہے۔آپ نے نہیں دیکھا کہ ماں اگر کبھی غصے میں بچے کو تھپڑ لگا دے اور وہ روتا ہی رہے تو پھر اللہ کی ایسی مہربانی ہوتی ہے کہ تھوڑی دیر کے بعد وہی ماں جب دوسروں کو کوئی چیز تقسیم کرتی ہے تو جس کو تھپڑ لگایا ہوتا ہے اس کو دوسروں کی نسبت زیادہ دے رہی ہوتی ہے۔اگر ماں بھی Compansate (تلافی) کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ میں نے اسے تھپڑ لگا دیا تھا، جھڑکی دی تھی، چلو اب اس کی تالیفِ قلب کراوں، تو اللہ تعالیٰ بھی اسی طرح مہربانی فرماتے ہیں۔اگر بندے پر کوئی مشکل یا پریشانی ڈال بھی دیتے ہیں تو پھر تھوڑے عرصے کے بعد اس بندے کی بھی تالیفِ قلب فرما دیتے ہیں۔

تو مجذوب وہ ہوتا ہے جس کو خود اللہ رب العزت چاہیں کہ یہ میری طرف آئے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف آگے چل رہا ہوتا ہے۔اس وقت ہر طرح سے بہار ہوتی ہے۔اسی کو کہنے والے نے کہا:

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
کوئی کھینچے لیے جاتا ہے وہ گریبانی

کوئی کُرتے سے پکڑ کر مجھے کھینچ کے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔اسی کو کسی عارف نے یوں کہا:۔

سن لے اے دوست! جب ایام بھلے آتے ہیں
گھات ملنے کی وہ خود آپ ہی بتلاتے ہیں

وہ خود ہی ملنے کا راستہ بتلا دیتے ہیں کہ تم اس طریقے سے مجھ سے ملاقات کر سکتے ہو۔......سبحان اللہ!...... جب اللہ تعالیٰ ہی چاہیں کہ میرا بندہ میری طرف آ جائے تو پھر راستہ کتنا آسان ہو جاتا ہے۔

بھئی! دیکھیں! آج کل اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر میں جانے کا راستہ کتنا آسان کر دیا ہے۔ایک وقت تھا کہ لوگ پیدل جاتے تھے۔ایک وقت تھا جب لوگ گھوڑوں اور اونٹوں پر جاتے تھے۔ایک وقت تھا جب لوگ بحری جہازوں پر جاتے تھے۔ایک وقت تھا جب موٹر گاڑیوں پر جاتے تھے۔اور آج وہ وقت ہے کہ ہوائی جہازوں پر چند گھنٹوں میں چلے جاتے ہیں۔جس پروردگار نے اپنے گھر کا راستہ آسان کر دیا،کیا اس نے اپنے تک آنے کا راستہ آسان نہیں کر دیا ہوگا؟اگر بیت اللہ تک جانے کا راستہ آسان ہو چکا ہے تو رب البیت کی طرف جانے کا راستہ بھی آسان ہو گیا ہے۔اس لیے آج کے دور میں ذکر وسلوک کی منزلیں طے کرنا اتنا مشکل نہیں ہے،آسان ہے۔بس! آرزوؤں کو توڑنا پڑتا ہے،غلط تمناؤں کو چھوڑنا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے اوپر ہمت کے مطابق عمل کرنا پڑتا ہے۔کوئی ایسا کام نہیں کرنا پڑتا جو بندے کے بس میں نہ ہو۔تو پھر یہ آسانی ہوئی نا۔کوئی مشکل کام نہیں۔پھر اللہ تعالیٰ خود بندے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔اسی لیے کسی نے کہا:۔

حسن کا انتظام ہوتا ہے
عشق کا یونہی نام ہوتا ہے

نام عشق کا لگا دیتے ہیں، اصل میں تو حسن کا انتظام ہوتا ہے کہ محبوب خود ملاقات کی تدبیر کر رہا ہوتا ہے کہ یہ ہمیں ملنے کے لیے آ جائے۔

عشقِ عاشق اور عشقِ محبوب کا تقابل:

امام ربانی امجد دالف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں فارسی کے دو شعر لکھے۔فرماتے ہیں:

عشقِ معشوقاں پنہاں است و ستیر
عشقِ عاشق با دو صد طبل و نفیر

''جومحبوبوں کا عشق ہوتا ہے وہ چھپا ہوا ہوتا ہے اور جو عاشق کا عشق ہوتا ہے وہ دوسو ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ ہوتا ہے۔''

یعنی محبوب شور نہیں مچایا کرتے کہ جی ہمیں ملنے کے لیے آ جاؤ، وہ چھپی آشنائی کرتے ہیں۔ وہ دل ہی دل میں چاہتے ہیں مگر ظاہر نہیں کیا کرتے۔لیکن جس عاشق کو عشق ہوگا وہ آہیں بھرے گا۔ادھر تذکرہ کر بیٹھے گا ادھر تذکرہ کر بیٹھے گا۔عاشق اپنی بات کو کھول بیٹھتا ہے۔اس لیے عاشق کے عشق کا لوگوں کو جلدی پتہ چل جاتا ہے۔آگے فرماتے ہیں: ؎

عشقِ عاشق آں بدن لاغر کند
عشقِ معشوقاں بدن فربہ کند

''جو عاشق کا عشق ہوتا ہے وہ بدن کو کمزور کر دیتا ہے، اور محبوبوں کا عشق بدن کو موٹا کر دیتا ہے۔''

جب بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نظر عنایت ہوتی ہے تو پھر اس کے اوپر عجب بہار کی کیفیت ہوتی ہے۔

عالمِ تحیّر:

سلوک کا کچھ راستہ انسان جذب کے طرز پر طے کرتا ہے اور کچھ راستہ سلوک کے طرز پر طے کرتا ہے۔ کتنے لوگ ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کھینچا۔ بہانے بنا دیے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچتے ہی چلے گئے۔ ہم بھی ذرا اپنی زندگی کو پیچھے مڑ کے دیکھیں تو واقعی حیرانی ہوتی ہے کہ ہم کیسے کھچ کے یہاں آ گئے! جیسے پہاڑی راستے پر گاڑی جا رہی ہو اور آدمی پیچھے مڑ کے دیکھے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یا اللہ! اس راستے سے گزر کر میں یہاں تک کیسے آ گیا ہوں! تصوف وسلوک کی زندگی میں بھی بعض اوقات بالکل اسی طرح نظر آتا ہے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یا اللہ! میں پچھلے سارے راستے کو عبور کر کے یہاں کیسے آ گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ راستہ آسان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کمزور بندوں پر مہربانی فرما دیتے ہیں۔ تو کبھی تو سالک بن کر راستہ طے کرنا پڑتا ہے اور کبھی مجذوب بن کر ہواؤں کے دوش پر پرواز کرنی پڑتی ہے۔ کبھی یہ تجلیات ہوتی ہیں اور کبھی وہ تجلیات ہوتی ہیں۔ یہ بات شیخ ہی سمجھتا ہے کہ اس سالک پر اس وقت کون سی تجلیات ہیں۔

شیطان کا داؤ:

کئی سالکین کو دیکھا ہے کہ جب ان کو جذب کی تجلیات سے کھینچا جا رہا ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اب میں کچھ بن گیا ہوں۔ میں رات کو جو خواب دیکھتا ہوں وہ دن کو پورا ہو جاتا ہے۔ میں جو دعا مانگتا ہوں وہ قبول ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ سمجھتے ہیں کہ اب مجھے شیخ کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ وہ بے نیاز بن جاتے

ہیں۔اصل میں شیطان داؤ لگا تا ہے کہ اب تو تیری اپنی کیفیت ایسی ہوگئی ہے کہ تیری دعائیں قبول ہوتی ہیں، تیرا کشف اب بالکل ٹھیک ہونے لگ گیا ہے،لوگ تیری طرف متوجہ ہونے لگ گئے ہیں،اس لیے اب تجھے شیخ کی کیا ضرورت ہے۔ایسے موقع پر کتنے اچھے اچھے لوگ دھوکہ کھا کر لڑھک جاتے ہیں اور راستے سے ہٹ جاتے ہیں۔

احساسِ محرومی بھی ایک نعمت ہے:

کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو پہلے بڑے ہی اچھے حالات میں کھینچا جا رہا ہوتا ہے،مگر راستے میں اللہ تعالیٰ ان پر تھوڑی سی آزمائش بھی ڈال دیتے ہیں۔

......گھر کی طرف سے آزمائش

......اولاد کی طرف سے آزمائش

......صحت کی طرف سے آزمائش

......کیفیات رُکی نظر آتی ہیں

اس موقع پر شیطان ان کے دل میں مایوسی ڈال دیتا ہے اور یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ او جی! ہم نے بیس سال لگائے مگر ہمیں کیا ملا۔بھئی! آپ کو جو یہ احساس حاصل ہے کہ آپ کو کچھ نہیں ملا، یہ احساس بھی آپ کو ملا ہے کہ نہیں ملا۔یہ احساس مل جانا کہ مجھے کچھ نہیں ملا، یہ بھی بڑی نعمت ہے۔

ھَل مِن مَّزِید کا معاملہ:

ایک بات ذہن میں رکھ لیجیے۔پوری زندگی میں کبھی بھی ایسا وقت نہیں آسکتا کہ بندہ یہ کہہ سکے کہ مجھے سب کچھ مل چکا ہے۔جس نے کہا کہ مجھے سب کچھ مل چکا ہے اس نے اپنے اوپر ترقی کے دروازے بند کر دیے۔یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ھَل مِن

مَّـزِیـد ہی معاملہ رہے گا۔انسان جتنی بھی ترقی کرتا چلا جائے ،اس کی زندگی میں ھَـل مِن مَّـزِیـد ھل من مزید کا معاملہ رہے گا۔اور دل چاہتا ہے کہ قریب ہو جائیں ،اور قریب ہو جائیں ،محبوب کے ساتھ اور زیادہ قرب کی کیفیت حاصل ہو جائے۔

جذب اور سلوک کی پہچان کیسے؟

جذب اور سلوک میں سے کون سی کیفیت بندے کے اوپر ہوتی ہے؟اس کو شیخ پہچانتا ہے۔تو نسبت سے اس کو پہچان ہوتی ہے۔اسی لیے اگر ایسے معاملے میں ہمیشہ شیخ کو اپنے حالات بتائے جائیں تو وہ بندے کو گائیڈ کر دیتے ہیں اور بندے کی بڑی بڑی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

اس ذکر وسلوک کے راستے میں جذب اور سلوک کی کیفیات کو سمجھنا انتہائی ضروری ہے۔اس سے بندے کو پتہ چلتا ہے کہ میں زندگی کے کس فیز میں سے گزر رہا ہوں۔جس نے اس کو سمجھ لیا بس وہ اپنے کام میں لگا رہنا۔قبض میں بھی اللہ کی رضا پر چل رہا ہوتا ہے اور بسط کی کیفیت میں بھی اللہ کی رضا پر چل رہا ہوتا ہے۔پھر اس کے راستے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بنتی ، بلکہ اس کی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔

قبولیتِ دعا کا وقت:

البتہ! یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اگر کسی کے اپنے اوپر قبض کی کیفیت ہے تو اس وقت اس کی اپنی دعا قبول ہوتی ہے۔...... یہ نکتے کی بات ذرا سمجھ لینا...... اگر کسی کے اوپر قبض کی کیفیت ہے تو اس کیفیت میں اگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف اور زیادہ رجوع کرے تو اس کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے۔کیونکہ یہ صبر کا وقت ہوتا ہے اور دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔یہ انسان ہی ہے کہ بچے کو جھڑکی پڑی اور بچہ پھر ماں کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے...... مجھے اٹھا لو، اٹھا لو، اٹھا لو۔اب ماں دیکھتی ہے کہ جھڑکی

بھی دی اور پھر بھی پیچھے آرہا ہے، تو پھر ماں اس کو اٹھا لیتی ہے اور اسے سینے سے لگا لیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی دیکھتے ہیں کہ میں نے اس کو قبض کی کیفیت میں رکھا اور یہ بندہ پھر بھی میرے ہی راستے پر چلتا رہا، پتہ چل گیا کہ یہ کیفیات کا طالب نہیں، یہ طالب مولیٰ ہے۔ ایسے وقت میں جب وہ بندہ دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو قبول کر لیتے ہیں۔ مگر کئی مرتبہ یہ معاملہ کٹھن ہوتا ہے۔

حالتِ قبض میں عطائے خداوندی:

حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندی بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان پر قبض کی کیفیت اتنی زیادہ آئی کہ کچھ حال احوال محسوس بھی نہیں ہوتے تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے سب کچھ ہی چلا گیا۔ چنانچہ وہ بڑا عرصہ استغفار بھی کرتے رہے، اللہ سے توبہ بھی کرتے رہے، آگے بڑھنے کی کوشش بھی کرتے رہے، مگر کچھ نہ محسوس ہوا۔ حتی کہ ایک دن خیال آیا کہ جب کچھ بھی کیفیت نہیں ہے تو پھر چلیں جا کر کوئی رزقِ حلال والا کام کریں۔ بچوں کو بھی تنگی ہے۔ چلو ایک طرف سے تو سہولت ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ اپنے گھر سے چل پڑے کہ میں جا کر دکان پر کام کرتا ہوں۔ راستے میں نماز کا وقت ہو گیا۔ ایک مسجد میں داخل ہوئے۔ مسجد میں سامنے جو نظر پڑی تو ایک دو شعر لکھے ہوئے تھے۔ ان کا پڑھنا تھا کہ ان کی زندگی ہی بدل گئی۔ چنانچہ پھر دوبارہ ذوق شوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جس قبض کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو نسبتِ نقشبندیہ سے سرفراز فرما دیا۔ اتنی بڑی نعمت مل گئی۔ وہ شعر کیا تھا؟ وہ شعر یہ تھے:

مفلسا نیم آمدہ در کوئے تُو
شیئاً للہ از جمالِ روئے تُو

''اے اللہ! میں تیری گلی میں مفلس بن کر حاضر ہوا ہوں۔ تو اپنے چہرے کے حسن کے صدقے کچھ مجھے بھی عطا کر دے۔''

دست بکشا جانبِ زنبیلِ ما
آفریں بردست و بر تُو

''وہ پیالہ جو میں نے لینے کے لیے پکڑا ہوا ہے، ذرا اپنا ہاتھ اسے دینے کے لیے میری طرف بڑھا دیجیے۔''

یہ اشعار ان کو اتنے اچھے لگے کہ انہوں نے وصیت فرمائی کہ جب میں مروں اور میرا جنازہ دنیا سے اٹھے تو کوئی ایک بندہ میرے جنازے کے آگے یہ اشعار پڑھتا ہوا جائے۔

ان اشعار نے اس عاجز کو بھی بڑا فائدہ دیا۔ جب کبھی حرم شریف میں جانے کا اتفاق ہوا تو رات کی تنہائی میں بیت اللہ شریف کے پاس جا کر تصور کرتا ہے کہ میں اس وقت شہنشاہ کے دربار میں کھڑا ہوں۔ پھر وہاں انسان اللہ کا دھیان کر کے انسان اپنے رب سے باتیں کریں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ان اشعار کو بیت اللہ شریف کے سامنے پڑھنے سے بندے کی ایسی کیفیت بنتی ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔

طلبِ مولیٰ کی قدردانی:

ہمارے مشائخ نے لکھا ہے کہ جو بندہ دنیا میں اللہ تعالیٰ سے دوستی کے لیے کوشش کرتا ہوگا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اپنے دشمنوں کی قطار میں کبھی بھی کھڑا نہیں فرمائیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بندہ دنیا میں اللہ کی محبت حاصل کرنے کے لیے تڑپتا رہا، مانگتا رہا، کبھی ادھر کی ٹھوکریں کبھی ادھر کی ٹھوکریں۔ سارا سارا دن

چٹائیوں کے اوپر بیٹھ کر اپنے جسم کے حصوں کو گھساتا رہا اور اس کے لیے بیٹھنا مشکل تھا، اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے اس طلب گار بندے کو دشمنوں کی قطار میں شامل کر دیں!؟ کبھی ایسا نہیں ہوسکتا۔ اے اللہ! ہم بھی تجھے چاہتے ہیں اور تیرے چاہنے ہی کی نیت لے کر اپنے گھروں سے چل کر تیرے گھر میں آئے بیٹھے ہیں، یا اللہ: ہمیں بھی آخرت میں رسوا نہ کرنا۔

نیک بننے کی تمنا اور اس کی قدر دانی:

حضرت اقدس تھانوی ﷫ نے ایک عجیب واقعہ لکھا ہے: فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک بندے کو کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: او میرے بندے! تو نیک کیوں نہیں بنا؟ وہ بندہ آگے سے جواب دے گا: اللہ! میں دنیا میں دعائیں تو مانگتا تھا، اللہ! تو مجھے نیک بنا دے۔ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہونے کے باوجود فرشتوں سے فرمائیں گے: او فرشتو! ذرا اس کے نامہ اعمال میں تو دیکھو، کیا یہ دعائیں مانگتا تھا؟ فرشتے نامہ اعمال کو دیکھیں گے اور کہیں گے: اے اللہ! اس کے نامہ اعمال میں لکھا ہے، یہ کہتا تھا: اللہ! تو مجھے نیک بنا دے، اللہ! تو مجھے اپنا بنا لے۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: فرشتو گواہ رہنا، یہ دنیا میں میری دوستی کا سوال کرتا تھا، میں نے اسے اپنے دوستوں میں شامل فرما دیا۔...... اللہ اکبر!!!

ان مجالس میں آنا اور بیٹھنا بہت ہی مبارک عمل ہے۔ ہمیں اس کے اجر و ثواب کا پتہ انشاء اللہ قیامت کے دن چلے گا۔

اللہ رب العزت ہمیں اپنی زندگی میں ان مجالس کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمادے۔ ہمیں امتحانوں سے محفوظ فرمادے، ہمیں بھٹکنے سے محفوظ فرمادے، الجھنے سے محفوظ فرمادے، پھسلنے سے محفوظ فرمادے۔ اپنی رحمت کے سہارے ہمیں خود ہی اپنی

منزل تک پہنچا دے۔ (آمین ثم آمین)

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾

دعا مانگنے کا ادب

بیان: حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

مجددی مدظلہم

اقتباس

اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہی اور ہے۔ بندہ ایک دفعہ مانگے دیتے ہیں، دوسری دفعہ مانگے دیتے ہیں تیسری دفعہ مانگے دیتے ہیں، جتنی بار مانگے اتنی بار دیتے ہیں، بار بار مانگیں بار بار دیتے ہیں۔ بلکہ جو شخص ہر چیز، ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگے اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنا ولی، اپنا دوست بنا لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ میرے غیر سے مانگتا ہی نہیں، صرف مجھ سے مانگتا ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔ کتنا فرق ہے!!

(حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد نقشبندی مجددی مدظلہ)

دعا مانگنے کا ادب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ كَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى اَمَّا بَعْدُ!
فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○
﴿اُدْعُوْنِىْ اَسْتَجِبْلَكُمْ ط﴾

و قال الله تعالىٰ فى مقام اخر
اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ ط

وَ قَالَ اللّٰهُ تَعَالىٰ فِى مَقَامٍ اخر
يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِىُّ الْحَمِيْدُ اِنْ يَّشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَ يَأْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ وَ مَاذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ
سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّتِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

اللہ کی بے شمار نعمتیں:

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بے انتہا نعمتوں سے نوازا ہے۔ہم ان نعمتوں کو گننا بھی چاہیں تو گن نہیں سکتے۔اگر کوئی بندہ کہے کہ میں آسمان کے تاروں کو گن سکتا ہوں تو مان لیں گے،ساری دنیاں کے درختوں کے پتوں کو گن سکتا ہوں تو مان لیں گے،ساری دنیا کے ریت کے ذرات کو گن سکتا ہوں تو مان لیں گے،لیکن اگر کوئی بندہ کہے میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو گن سکتا ہوں تو ہم کبھی اس بات کو نہیں مانیں

گے اس لیے کہ کائنات کو پیدا کرنے پر پروردگار نے فرمایا:

اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

''اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا بھی چاہو تو تم گن نہیں سکتے۔''

احسانات خداوندی اور ہم:

غور تو کریں اگر اللہ تعالیٰ ہمیں بینائی نہ دیتے تو ہم اندھے ہوتے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں سماعت نہ دیتے تو ہم بہرے ہوتے، اللہ تعالیٰ ہمیں بولنے کی طاقت نہ دیتے تو ہم گونگے ہوتے، ہاتھ اور پاؤں نہ دیتے تو لنگڑے ہوتے، اگر اللہ تعالیٰ صحت نہ دیتے تو ہم بیمار ہوتے، کھانے کو نہ دیتے تو ہم بھوکے ہوتے، پانی نہ دیتے تو ہم پیاسے ہوتے، گھر نہ دیتے تو ہم بے گھر ہوتے، اولاد نہ دیتے تو لاولد ہوتے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں مال نہ دیتے تو ہم فقیر ہوتے، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں دماغ نہ دیتے تو ہم پاگل ہوتے، علم نہ دیتے تو جاہل ہوتے، عزت نہ دیتے تو ہم ذلیل ہوتے۔

یہ جو عزتوں بھری زندگی ہم گزارتے پھر رہے ہیں یہ سب اس مولا کا کرم اور احسان ہے۔...... اللہ اکبر کبیرا!

ایک پیالہ پانی کی قیمت:

اب ذرا غور کیجیے۔ ہارون الرشید نے ایک دفعہ پینے کے لیے پانی مانگا۔ ٹھنڈا پانی پیش کیا گیا۔ ایک عالم باللہ وہاں موجود تھے انہوں نے کہا: بادشاہ سلامت! پینے سے پہلے میری ایک بات سن لینا: اگر آپ کو پیاس لگے اور پوری دنیا میں اس پانی کے پیالے کے سوا پانی نہ ہو اور دینے والا کہے کہ مجھے اس کی قیمت چاہیے تو کتنی قیمت دے کر یہ پانی خریدیں گے۔ اس نے کہا: آدھی حکومت دے کر میں پانی لے کر پیوں گا، اس لیے کہ جان نکل رہی ہو گی۔ اس نے کہا: اچھا! پانی آپ کے پیٹ میں چلا

جائے اور پیشاب بن کر جسم میں رک جائے اور خارج نہ ہو تو یہ بھی ایک بیماری ہے...... جن بندوں کو یہ بیماری ہوتی ہے وہ مرغے کی طرح تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے کہ بے چاروں کی جان نکل رہی ہے۔ ہم نے پہلوانوں کو آنسوؤں سے روتے دیکھا یہ اتنی تکلیف دہ بیماری ہوتی ہے...... اگر یہی پیشاب رک جائے اور ایک طبیب کے پاس اس کی دوا ہو اور وہ کہے کہ مجھے اس کی قیمت دو پھر دوائی دوں گا تو کتنی قیمت دے کر خریدیں گے؟ اس نے کہا: آدھی حکومت دے کر۔ اس نے کہا بادشاہ سلامت! معلوم یہ ہوا کہ آپ کی پوری سلطنت اور حکومت پانی کا ایک پیالہ پینے اور پیشاب کی شکل میں جسم سے گزار دینے کے برابر ہے۔ پھر آپ نے تو ہزاروں پیالے پانی پیے، کیا کیا مشروب پیے، آپ بتائیں آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر کیسے ادا کر سکتے ہیں۔

قدم قدم پر ہم اللہ رب العزت کے احسان مندی میں ڈوبے ہوئے ہیں، اللہ رب العزت کے احسانات میں غرق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنا شکر گزار بندہ بنائے۔

فالج سے بچنے کا قدرتی انتظام:

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ہر بندے کے بلڈ کے اندر کئی دفعہ کلوٹ بن جاتا ہے۔ اگر وہ بلڈ کلوٹ انسان کے دماغ کے اندر پہنچ جائے تو جس حصہ کو بلاک (Block) کر دے، وہ حصہ فالج زدہ ہو جاتا ہے۔ وہ کلوٹ بھی پھرتا رہتا ہے اور اللہ رب العزت اسے اس جگہ پہنچنے نہیں دیتے۔ ہمیں پتا بھی نہیں ہوتا اللہ رب العزت کی ہم پر کتنی بڑی مہربانی ہوتی ہے کہ اللہ نے ہمیں اتنے مہلک مرض سے بچایا ہوا ہوتا ہے۔ کتنا امیر انسان کیوں نہ ہو اگر اس کو کبھی نیند نہ آئے، تو دوسرے چوتھے دن اس کا کیا حال ہو گا۔ کتنی پرسکون نیند ہم روزانہ سوتے ہیں۔ میرے مولا کا کتنا بڑا کرم ہے ہم پر، ہم ان نعمتوں کو گن بھی نہیں سکتے۔ بس اتنی بات ہے کہ ہمیں ان نعمتوں کا شکر ادا کرنا

چاہیے۔ انسان کمزور ہے۔ نعمتیں لیتا بھی ہے اور پھر بھول بھی جاتا ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ:

Allah gives and forgives.

Man gets and forgets.

اللہ دیتا بھی ہے اور معاف بھی کر دیتا ہے۔

بندہ لیتا بھی ہے اور بھول بھی جاتا ہے...... اللہ اکبر کبیرا!

پرودگار عالم کی پسند:

بہر حال اللہ رب العزت اس چیز کو پسند کرتے ہیں کہ میرے بندے مجھ سے مانگیں اور میں ان کو عطا کروں۔ میرے بندے مجھ سے محبت کا تعلق جوڑ لیں۔ اب اس کی ایک دلیل سن لیجیے۔

قرآن مجید میں لوگوں نے جو سوالات پوچھے ان کو بھی مینشن (Mention) کروایا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی علیہ السلام کی زبان مبارک سے اس کا جواب بھی دیا۔ اس کی ایک ترتیب بنا دی ''یَسْئَلُوْنَکَ'' کے لفظ کے ساتھ Question کروایا گیا اور ''قُلْ'' کے لفظ کے ساتھ اس کا جواب دلوایا۔ مثال کے طور پر:

- ...... یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَ هِلَّةِ ...... یہ سوال ہے

قُلْ هِیَ مَوَاقِیْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ...... اللہ نے جواب اپنے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے دلوایا۔

- ...... یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی ...... یہ سوال ہے

قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ...... جواب ہے

- یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْمَحِیْضِ ...... یہ سوال ہے

﴿قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيْضِ﴾...... جواب ہے یَسْئَلُوْنَکَ کے ذریعے سوال اور قُلْ کے ذریعے اس کا جواب پورے قرآن میں یہی ترتیب رکھی۔

ایک سوال ایسا تھا کہ پوچھنے والوں نے پوچھا تو پروردگار کو اتنا اچھا لگا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی ذریعے سے جواب دینے کی بجائے براہ راست خود جواب دیا۔ وہ سوال اتنا اچھا لگا کہ ترتیب ہی بدل دی۔ فرمایا اے میرے محبوب:

﴿وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ﴾

''اور جب تجھ سے میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو میں قریب ہوں''

یہاں اللہ تعالیٰ نے سوال بیان کر کے خود ہی جواب عطا فرما دیا۔

تو اللہ اور بندے کا یہ تعلق ایسا ہے کہ اس میں اللہ نے درمیان میں واسطے کو بھی ایک طرف رکھ کر جواب دیا...... وہ کتنا چاہتے ہیں کہ بندہ میرے ساتھ تعلق جوڑے۔

خالق اور مخلوق سے مانگنے میں فرق:

مخلوق سے بھی مانگتے دیکھا، مالک سے بھی مانگتے دیکھا، مگر دونوں میں بڑا فرق ہے۔ بندوں سے کوئی چیز اگر آپ بار بار مانگیں گے تو وہ ناراض ہو جائیں گے ایک دفعہ مانگیں گے تو دیں گے، دوسری دفعہ مانگیں گے تو دیں گے، تیسری دفعہ مانگیں گے تو کنی کترائیں گے۔ چوتھی دفعہ مانگیں گے تو پھرتی دکھائیں گے۔ کہیں گے: کیا ہے اس کو ہر وقت مانگتا ہی رہتا ہے؟ تعلق توڑ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہی اور ہے۔ بندہ ایک دفعہ مانگے دیتے ہیں، دوسری دفعہ مانگے دیتے ہیں تیسری دفعہ مانگے دیتے ہیں، جتنی بار مانگے اتنی بار دیتے ہیں، بار بار مانگیں بار بار دیتے ہیں۔ بلکہ جو شخص ہر چیز ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگے اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنا ولی، اپنا دوست بنا لیتے

ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ میرے غیر سے مانگتا ہی نہیں، صرف مجھ سے مانگتا ہے۔ یہ میرا دوست ہے۔ کتنا فرق ہے!!

کسی امیر آدمی سے تھوڑا مانگو تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ کسی منسٹر (وزیر) کے پاس مجمع میں چلے جائیں کہ ایک روپیہ دے دو! وہ کہے گا تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ اسی طرح غریب کے پاس چلے جائیں کہ بلین ڈالر دے دیجیے، وہ کہے گا: بد بخت۔ غریب سے زیادہ مانگو تو وہ ناراض، امیر سے کم مانگو تو وہ ناراض۔ ''سبحان اللہ''، اللہ رب العزت وہ ذات ہے کہ بندہ اس سے جتنا مانگے اللہ اتنا ہی دیتے ہیں۔

خالق اور مخلوق کے دینے میں فرق:

حدیث پاک میں آتا ہے کہ اگر کوئی بندہ اپنے جوتے کا ٹوٹا ہوا تسمہ بھی اللہ سے مانگے تو اللہ وہ بھی خوش ہو کر عطا فرماتے ہیں۔ کئی دفعہ مخلوق دیتی ہے مگر ناراض ہو کر۔ جیسے آپ ڈرائیونگ کر رہے ہیں، والدہ قریب بیٹھی ہیں، کہیں کھڑے ہوئے تو ایک مانگنے والا پہنچ گیا۔ اب اس نے شیشہ کھٹکھٹایا۔ آپ اشارہ بھی کرتے ہیں کہ معاف کر دو۔ وہ بھی بڑے صاحب استقامت ہیں، آپ کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ نہیں ہٹتے تو آپ کو غصہ آتا ہے کہ منع کرنے کے باوجود نہیں جاتا۔ اتنے میں آپ کی امی کہہ دیتی ہیں کہ بیٹا کچھ دے دو۔ اب اماں نے کہہ دیا، بات تو ماننی ہے۔ آپ جیب سے روپیہ نکالتے ہیں لیکن جب اس کو دے رہے ہوتے ہیں تو اس کو غصے کی نگاہوں سے دیکھ بھی رہے ہوتے ہیں۔ تو مخلوق دیتی بھی ہے تو ناراض ہو کر۔ قربان جائیں اس پروردگار پر کہ جب بھی بندوں کو دیتا ہے کبھی ناراض ہو کر نہیں دیتا۔ وہ ہمیشہ خوش ہو کر عطا کرتا ہے۔ جب بھی بندوں کو دیتا ہے خوش ہو کر دیتا ہے۔

پھر یہ بھی دیکھا کہ مخلوق کبھی دے دیتی ہے کبھی معذرت بھی کر لیتی ہے کہ

...... کاروباری حالات اچھے نہیں،

..... آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں،

..... ابھی تو میں نہیں کر سکتا۔

تو معلوم ہوا کہ اللہ رب العزت وہ ذات ہیں کہ جب بھی مانگا، جس نے مانگا اور جتنا مانگا، اللہ کے خزانوں میں کمی کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔

مخلوق اگر دن میں دیتی ہے تو رات کو دروازے بند۔ اگر چھٹی کا دن ہے تو بنکوں کے دروازے بھی بند۔ اللہ کا وہ ایسا در ہے کہ نہ دن میں بند ہوتا ہے نہ رات میں بند ہوتا ہے، نہ چھٹی ہے، جو بندہ جب مانگے اسے ملتا ہے، وہ ایسا پروردگار ہے۔

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ﴾

''نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند آتی ہے۔''

کیوں؟ اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مانگنے والے بندے مانگیں اور دینے والے کو اونگھ آرہی ہو۔ اگر دینے والا ہی سو رہا ہو تو یہ دینے والے کی عظمت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اللہ وہ ذات ہے جو نیند اور اونگھ سے مبرہ اور منزہ ہے۔ تم جس وقت بھی مانگو گے اپنے مولا کو دینے والا پاؤ گے۔

مخلوق پہلے اپنوں کو دیتی ہے۔ اگر کسی کو اقتدار مل گیا تو جنہوں نے ووٹ دیے ہوں گے اور جنہوں نے مدد کی ہوگی پہلے ان کو دیں گے۔ تو نوازتے بھی ہیں تو پہلے اپنوں کو۔ اللہ کا معاملہ الگ ہے وہ دیتا ہے، اپنوں کو بھی دیتا ہے اور غیروں کو بھی دیتا ہے۔ ایمان والوں کو بھی دیتا ہے اور بے ایمانوں کو بھی دیتا ہے، وہ وفاداروں کو بھی دیتا ہے تو ساتھ غداروں کو بھی دیتا ہے۔ مخلوق اگر کسی کو کچھ دے تو پھر کئی دفعہ لوگوں کو گفٹ لے کر جاتے ہوئے دیکھا ہے، آنے پر پوچھتے ہیں، کیا لائے ہو۔

سبحان اللہ..... ! اللہ وہ ذات ہے جو آنے والے سے نہیں پوچھتے کیا لائے ہو؟ بلکہ آنے والے سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے کیا لینے آئے ہو؟ کریم ہے نا! .....

اللہ اکبر کبیرا......!!!

بادشاہ اگر کسی کی دعوت کرے اور وہ کھانا اپنے گھر سے لے کر جائے تو کیا بادشاہ خوش ہوگا؟ بلکہ وہ کہے گا کہ میرے دستر خوان پر لانے کی کیا ضرورت تھی؟ کسی عارف نے کہا:

بَلَغْتُ عَلَى الْكَرِيْمِ بِغَيْرِ زَادٍ
مِنَ الْاَحْوَالِ وَالْكَرْبِ السَّرِيْرِ
كَرِيْماً ذَاتَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ
اِذَا كَانَ الْغَفُوْرُ عَلَى الْكَرِيْمِ

''میں کریم کے دروازے پر آ پہنچا اور میرے پاس کوئی سامانِ سفر بھی نہیں تھا۔ کریم کے پاس جانا ہو تو لے کر جانا اچھا نہیں لگتا۔ وہ کریم آقا ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ میرے بندے مجھ سے لینے کے لیے میرے در پر آ گئے، میرے لیے یہی کافی ہے۔

پروردگارِ عالم سے مانگنے کے آداب:

اللہ سے دعا کرنا ایک عبادت ہے، بلکہ دعا عبادت کا مغز ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ

''دعا عبادت کا مغز ہے''

دعا کے بھی کچھ آداب ہیں:۔

دل کھول کر مانگیں:

دعا کی محفل میں مل کر بیٹھیں تو اللہ سے جو چاہیں خوب مانگیں۔ ہر بندے کی اپنی

اپنی پہنچ ہوتی ہے کہ کوئی انسان کتنا مانگ سکتا ہے۔مگر جب اللہ سے مانگنا ہےتو دل کھول کر مانگیں۔ہم بندے ہیں، ہمیں کئی دفعہ اللہ سے مانگنا بھی نہیں آتا۔

ایک صاحب مجھے ملے۔کہنے لگے: او جی! اللہ تعالیٰ میری عمر بھی آپ کو لگا دے۔میں نے کہا: واہ بھئی واہ! اس کے ہاں کس کی کمی ہے کہ وہ پہلے لے گا اور پھر دے گا۔اللہ کے بندے دعا دینی ہےتو یوں دو کہ اللہ عمر میں برکت دے۔رزق میں برکت دے۔قبولیت عطا فرمائے۔یہ کیا بات ہوئی کہ میری عمر بھی آپ کو لگا دے؟ یعنی ادھر فرض کم ہوگیا تو ادھر سے نکال کر پورا کر دو یہ تو دنیا کے مسئلے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔تو واقعی ہمیں اللہ سے مانگنا نہیں آتا۔

ایک مرتبہ ایک خاتون آئی، اس کی اولاد نہیں تھی۔اب وہ پردے کے پیچھے بیٹھی اپنی بات کر رہی ہے، بس میں اللہ سے اولاد مانگتی ہوں، مجھے اللہ صرف بیٹا دے دے، میں اور کچھ نہیں مانگتی۔میں نے تو پھر اس کو اچھی طرح سمجھایا۔میں نے کہا پتہ ہے کس سے مانگ رہی ہو؟ سمجھ نہیں ہے کہ اللہ سے کیسے مانگنا ہے؟ یہ کوئی مانگنے کا طریقہ ہے کہ میں صرف ایک بیٹا مانگتی ہوں۔میں نے کہا کہ اگر اللہ تمہیں خاوند کی محبت سے محروم کردے تو کیا حال ہوگا؟ بینائی سے محروم کر دے، اللہ تعالیٰ تمہیں عزت سے محروم کر دے کیا بنے گا؟ یہ کیا بات ہوئی کہ یہی مانگتی ہوں اور کچھ نہیں مانگتی۔اللہ سے مانگنا ہی نہیں آتا۔میں نے کہا اللہ کی بندی! آپ کو کہنا چاہیے کہ میں اللہ سے سب کچھ مانگتی ہوں اور میں اللہ سے بیٹا بھی مانگتی ہوں۔فقیر جو ٹھہرے تو فقیر کو مانگنے میں کوئی شرم ہوتی ہے؟ کبھی کسی فقیر کو شرماتے ہوئے دیکھا ہے؟ اسے تو مانگنے میں کوئی شرم نہیں ہوتی ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتا ہے۔تو تمہیں مانگتے ہوئے کیوں شرم آتی ہے؟ ...... میں صرف یہ مانگتا ہوں۔مشروط دعائیں نہیں مانگنی چاہیے۔اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہیں، انکی ایک رحمت کی نظر سے ہماری زندگی کی تمام نعمتیں ہمیں ایک پل

میں مل سکتی ہیں۔ ایسی ذات سے یہ کہنا کہ اور کچھ نہیں مانگتی، یہ دعا مانگتی ہوں، سخت بے ادبی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ سے مانگیں تو اس کا درد دیکھ کر مانگیں۔

یقین کے ساتھ مانگیں:

ہم نے دیکھا ہے کہ فقیر جب کسی بڑے کے دروازے پر آجاتے ہیں تو اونچی صدا لگاتے ہیں۔ اسے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بڑا دروازہ ہے خالی نہیں جاؤں گا۔ تو فقیر کو اگر دنیا کے کسی بڑے کے دروازے سے اتنی توقع ہے تو ہم اللہ کے در پر بیٹھے ہیں، پکا یقین ہونا چاہیے کہ جو دعائیں مانگیں گے یقیناً قبول ہوں گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر دنیا مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ مصلحت کو دیکھیں گے کہ یہ چیز بہتر ہے یا نہیں، اور اگر مصلحت کو دیکھیں تو ہمارا ہی فائدہ ہے۔

عافیت والا رزق مانگیں:

ہم کئی دفعہ ایسی باتیں مانگ لیتے ہیں جو ہمارے لیے مصیبت ہوتی ہیں۔ ایک بندہ مال پیسہ مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس بندے کو دولت ملے گی تو اس کی اولاد نافرمان بن جائے گی۔ اب وہ دولت کیا مانگنی کہ جو گھر میں آئے تو اولاد ماں باپ کی نافرمان بن جائے، ایسی دولت پر اللہ کی لعنت ہو۔ مانگیے تو عافیت والا پیسہ مانگیے۔ حلال، طیب، پاکیزہ، جو آئے تو دین لے کر آئے۔ جو دولت وبال لے کر، مصیبت لے کر آئے اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ مال و دولت کا ہمیشہ آنا کوئی اچھا نہیں ہوتا۔ یہ آتا ہے، بیسیوں وبال ساتھ لے کر آتا ہے۔ تو اس لیے اللہ سے مانگیے تو عافیت والا، پاکیزہ مال مانگیں، طیب مال مانگیں۔

اللہ تعالیٰ مصلحت کو دیکھتے ہیں:

اب دیکھیے ،توجہ فرمائیں! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کیساتھ سفر کیا تو انہوں نے ایک بچے کو قتل کر دیا۔اب ظاہراً تو کتنا عجیب معاملہ تھا۔دیکھنے والے کو بھی پتہ چلتا ہے۔ماں باپ بھی بیٹے سے محروم ہو گئے۔مگر اللہ تعالیٰ مصلحت کو دیکھتے ہیں۔بعد میں پوچھنے پر بتایا کہ یہ بیٹا ان کا نافرمان بنتا،ان کی ناک میں دم کر دیتا،ان کو مصیبت میں مبتلا کر دیتا۔مفسرین نے لکھا ہے کہ اس بیٹے کے بدلے اللہ تعالیٰ نے ان ماں باپ کو ایک بیٹی دی اور بیٹی کی نسل سے اللہ تعالیٰ نے انبیا کو پیدا فرمایا،ایسی بیٹی اللہ نے انکو عطا کی جس کی نسل سے اللہ نے اولیا پیدا فرمائے۔تو اللہ تعالیٰ مصلحت کو دیکھتے ہیں۔

یا تو اس کی دعا کے بدلے کوئی مصیبت ٹال دیتے ہیں ورنہ تو اسکو ذخیرہ بنا دیتے ہیں۔قیامت کے دن اس بندے کو دیں گے۔حدیث پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب بندہ دیکھے گا کہ مانگی جانے والی دعاؤں کے بدلے اتنا اجر ملا، کہے گا: کاش! دنیا میں میری کوئی دعا پوری نہ ہوتی ،سب دعائیں ذخیرہ بنتی۔آج اللہ آپ مجھے اپنی شان کے مطابق عطا فرماتے۔تو مومن کے تو مزے ہی مزے۔تینوں صورتوں میں سے جو بھی ہو جائے ہمارے لیے فائدہ ہے۔لہٰذا مانگنے میں کمی نہیں ہونی چاہیے۔ہر چیز مانگو، ہر وقت مانگو،ٹکا کے مانگو، مانگنا سیکھنا پڑتا ہے۔

کچھ دوست مل جل کر کہیں بیٹھے ہوئے تھے۔ایک صاحب نے کہا کہ یا اللہ! مجھے پچاس کروڑ ڈالر دیں۔تو دوسرے نے کہا: ''اتنے''!؟۔اس نے کہا: تجھ سے نہیں مانگے تو کیوں پریشان ہوتا ہے؟ اللہ سے مانگے ہیں۔جب اللہ سے مانگنے ہیں تو پھر اس میں کمی کیوں کی جائے۔بس ہمیں مانگنا ہی نہیں آتا جس کی وجہ سے کوتاہی ہو جاتی ہے۔ورنہ دینے میں دیر نہیں ہے۔

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیں احوال
کہ آگ لینے جائے اور پیغمبری مل جائے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں......

حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک فرشتہ رات کے آخری پہر میں اعلان کرتا ہے:

''ہے کوئی سوال کرنے والا جس کو عطا کیا جائے۔''

ہم کو شکوہ ہے ہمارا مدعا ملتا نہیں
دینے والے کو گلا ہے کہ گدا ملتا نہیں
ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے کوئی راہرو منزل ہی نہیں
طور تو موجود ہے موسیٰ ہی نہیں
لفظ و شاعری دیکھ کر بندے کو کہتا ہے کریم
دینے والا دے بھی کسے لفظِ دعا ملتا ہی نہیں

اللہ تعالیٰ کہتے ہیں میں کس کو دوں؟ کوئی ہاتھ بھی آگے بڑھائے نا۔ تہجد کے وقت سوئے ہوئے ہوتے ہیں۔ اللہ رب العزت تو دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اس لیے جو بندہ اللہ رب العزت سے جتنا زیادہ اضطراب کے ساتھ مانگے گا اتنی جلدی قبولیت ہوگی۔

سراپا سوال بن کر دعا مانگیں:

یہ عاجز پہلے بھی عرض کرتا ہے کہ دعائیں مانگنے سے قبول ہوتی ہیں، دعائیں پڑھنے سے قبول نہیں ہوتیں۔ جیسے آج کل ہمیں دعائیں پڑھنے کی عادت ہے۔

رَبَّنَا اٰتِنَا...... رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا...... پھر کہتے ہیں دعائیں قبول نہیں

ہوتیں۔ مانگنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سر کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک انسان کا رواں رواں اللہ کے سامنے فریاد کر رہا ہوتا ہے، ایسے مانگیں تو پھر دیکھو

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ

اب کئی ایمان والوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ دعا مانگتے ہیں تو ایسے جیسے اللہ کے ذمے کام لگا رہے ہیں۔ جیسے بہت سے بزنس مینوں کو دیکھا، آتے ہیں اپنے کام سے اور کہتے ہیں کہ تم فلاں کام کر لینا۔ تم یہ کام دیکھ آنا۔ تم یہ کام کر لینا۔ یہ بھی دعا ایسے کرتے ہیں جیسے، معاذ اللہ، اللہ کے ذمے کوئی کام لگا رہے ہیں۔ اللہ میرے بیٹے کو اچھی بیوی مل جائے، میری بیٹی کو اچھا رشتہ مل جائے، خاوند کا بزنس اچھا ہو جائے جیسے؟ ایسے دعا کرتے ہیں۔ اس کو دعا تو نہیں کہتے۔ دعا میں تو انسان کے اندر عاجزی ہوتی ہے۔ ذرا فقیر کو دیکھیں! ایک روپیہ مانگنا ہوتا ہے تو کپڑے بھی پھٹے پرانے پہن کر آتا ہے، ہاتھ میں کشکول پکڑتا ہے، سامنے آتا ہے تو یوں نہیں کھڑا ہوتا چھپ کر کھڑا ہوتا ہے۔ ہاتھ بھی کپکپا رہا ہوتا ہے اور آواز بھی کپکپا رہی ہوتی ہے۔ چن چن کے الفاظ لا رہا ہوتا ہے جو بندے کے دل کو گرما دیتے ہیں اور ایک روپیہ مانگتا ہے۔ جس نے ایک روپیہ مانگنا ہوتا ہے وہ اتنی عاجزی سے مانگتا ہے تو جس نے اللہ سے اللہ کو مانگنا ہو تو اس کو کتنی عاجزی کرنی چاہیے!! تو دعا ایسے مانگیں جیسے مانگنے کا طریقہ ہے، پھر دیکھیں اللہ کی کیسی رحمتیں آتی ہیں۔ یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ ہمارے گناہوں کے باوجود، خطاؤں کے باوجود وہ مالک دروازے کو بند نہیں کرتا۔

آدابِ شاہانہ کا تقاضا:

آدابِ شاہانہ کا تقاضا یہ تھا کہ جو بندہ اللہ رب العزت ﷻ کے در سے پیٹھ پھیر کر جاتا تو اللہ تعالیٰ اس کی پیٹھ کے اندر لات لگاتے اور اس کے لیے دروازہ بند کر دیتے۔ اس طرف سے منہ پھیر کر جا رہا ہے اب تیرے لیے دروازے بند ہیں۔ مگر

مالک ایسا نہیں کرتا۔ غفلت میں پڑا پڑا بندہ بوڑھا ہو جائے، اب بیوی نہ رہی، اولاد نہ رہی، بھائی بہن چلے گئے، ماں باپ چلے گئے۔ اب یہ خاندان کا اکیلا بندہ اور وہ بھی کسی کے گھر میں ٹکا ہوا ہے۔ انہوں نے بھی کہا آپ ساری رات کھانستے ہیں، ہمارے بچے تنگ ہوتے ہیں، آپ یہاں سے چلے جائیں، انہوں نے بھی دھکا دے دیا۔ اب وہ بوڑھا جس نے کبھی مسجد کا دروازہ نہیں دیکھا تھا، جمعہ نہیں پڑھتا تھا، عید کی نماز نہیں پڑھتا تھا، وہ باغی بوڑھا اب سوچتا ہے کہ میں کدھر جاؤں؟ تو اسے کوئی دروازہ نظر نہیں آتا۔ اب رب یاد آتا ہے چلو اللہ کے دروازے پر جاتا ہوں۔ اب وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے، ہانپتے ہوئے، کانپتے ہوئے قدم بڑھاتا ہے پھر تھک کر بیٹھ جاتا ہے، پھر چلتا ہے اس حالت میں جا رہا ہوتا ہے، اللہ رب العزت اس باغی بوڑھے سے بھی سوال نہیں پوچھتے میرے بندے جوانی کہاں ضائع کی؟ جب حسن کا مال تھا، جب مال ہی مال تھا، جب فضل وکمال تھا، اس وقت کو کہاں لگاتے رہے؟ یہ سب نعمتیں ضائع کر آئے، اب تجھے میرا گھر یاد آیا؟ اللہ اس کو گلہ نہیں دیتے، پوری زندگی کا طعنہ نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے آخر سوچا کہ میرا کوئی پروردگار ہے، آیا تو میرے ہی دروازے پر ہے، مالک کو کتنی خوشی ہوتی ہے؟ مالک فرماتے ہیں: یہ باغی بوڑھا میرے گھر کی طرف آتا ہے، یہ ایک بالشت چلتا ہے میری رحمت دو بالشت چلتی ہے، یہ چل کر آتا ہے میری رحمت دوڑ کر آتی ہے۔ اتنے کریم ہیں وہ پروردگار...... اللہ اکبر!...... پھر کیوں نہ انسان ان سے مانگے۔

پروردگارِ عالم کا اندازِ محبت:

جب بچہ ماں سے روٹھ جائے تو ماں بچے کو مناتی ہے کہ بیٹے! ماں سے نہیں روٹھا کرتے۔ بیٹے! ماں سے بولو! بات کرو! کیوں اپنی ماں سے خفا ہو؟ جس طرح ماں

شفقت بھرے لہجے میں بچے کو سمجھاتی ہے اللہ تعالیٰ اسی شفقت بھرے لہجے میں بندوں کو سمجھا کر کہتے ہیں:

يَآ يُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ

اے انسان تجھے تیرے کریم پروردگار کے دروازے سے کس چیز نے دھوکے میں رکھا کہ کریم آقا کو بھی چھوڑ کر کہیں اور جا رہا ہے، دھکے کھاتا پھرتا ہے۔ روتا ہے۔ جوتیاں تیری گھس گئیں اور اعمال نہ سنورے، کیوں نہیں تو اپنے رب کے دروازے پر آ جاتا جس کی ایک رحمت کی نظر تیرے سب مسئلوں کو حل کر دے گی۔

يَآ يُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ

اتنے پیار سے سمجھاتے ہیں۔ بندے کو چاہیے کہ اللہ رب العزت کے سامنے عاجزی کے ساتھ جتنا مانگ سکتا ہے مانگے۔ ہمیشہ لینے والوں کو اپنے دامن کے چھوٹے ہونے کا شکوہ رہا، دینے والے کی دین ہمیشہ بڑی ہوتی ہے۔ اللہ کی دین تو بہت بڑی ہے۔...... اللہ اکبر کبیرا!

محبت بھری دعا اور اس کی قدر دانی:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ دعا مانگتے ہیں:

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ وَاجْعَلْ قَبْرِيْ فِيْ بَلَدِ حَبِيْبِكَ

اے اللہ! اپنے راستے میں شہادت عطا فرما اور اپنے حبیب کے شہر میں دفن ہونا نصیب فرما۔

مانگنے والے نے تو اتنا مانگا، دینے والا کتنا قدر دان ہے کہ وہ شہادت پہاڑ کی چوٹی پر مل سکتی تھی، گلی میں مل سکتی تھی، کسی چٹان پہ مل سکتی تھی، کسی صحرا میں مل سکتی تھی...... نہیں...... پروردگار نے شہادت بھی دی تو کہاں دی؟...... مسجد نبوی ہے، مصلّاءِ نبوی ہے، وضو کی حالت میں، نماز کے اندر، اللہ کے قرآن کی تلاوت کر

رہے ہیں، حملہ ہوتا ہے وہ ان کی شہادت کا سبب بنتا ہے۔ انہوں نے یہ تو نہیں مانگا تھا کہ مجھے مصلاءِ نبوی پر شہادت دینا بلکہ انہوں نے مانگا تھا کہ اللہ کے محبوب کے شہر میں دفن ہونے کی توفیق عطا فرمانا۔ میرے مالک نے دعا قبول کر لی۔ جنت البقیع میں دفن ہو جاتے تو دعا پوری ہو جاتی؟ مگر نہیں۔ دینے والے کی دین زیادہ...... امید سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔ کہاں دفن ہونا نصیب فرمایا، اپنے محبوب کے قدموں میں روضہءِ انور کے اندر دفن ہونے کی سعادت نصیب فرمائی۔ اس سے مانگ کر تو دیکھیں، پھر پتہ چلے گا کہ اس کی دین کیا ہے۔ وہ امیدوں سے ہمیشہ زیادہ دیتا ہے۔ بڑا قدردان ہے...... اللہ اکبر کبیرا!

بگڑے بندے کا انتظار:

آپ ذہن میں رکھیے کہ اگر کسی ماں کا بیٹا بچھڑ جائے تو اس کا کیا حال ہوتا ہے، وہ بے چاری روتی ہے، نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے، پریشان رہتی ہے۔ اس کو راتوں کو نیند نہیں آتی اور ذرا اونگھ آجائے اور دروازہ ہوا کی وجہ سے آواز دے تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے کہ کہیں میرا بیٹا تو نہیں آگیا۔ ماں کو بیٹے کا انتظار اتنا ہوتا ہے۔ مگر ہمارے مشائخ نے لکھا ہے کہ بچھڑے بیٹے کا انتظار ماں اتنا نہیں کرتی جتنا کہ بگڑے بندے کا انتظار اس کا پروردگار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ زیادہ انتظار کرتے ہیں کہ میرا یہ بگڑا ہوا بندہ کب میرے دروازے پر واپس آجائے مانگنے کا وقت ہے۔

اللہ کے در کو تھامے رکھیے:

یہ بات ذہن میں رکھنا کہ ہمیں ملنا ہے تو اللہ کے در سے ملنا ہے اور کہیں سے کچھ نہیں ملنا۔ ہم نے دنیا میں دیکھا ہے کہ جس کتے کے گلے میں پٹے کا نشان ہوتا ہے وہ ہر طرف پھرتا رہتا ہے کوئی روٹی کا ٹکڑا نہیں ڈالتا، ہر بندہ کہتا ہے کہ اپنے مالک کے دروازے پر جا کر کھائے گا۔ جس کتے کے گلے میں پٹہ پڑ جائے اسے کوئی ٹکڑا نہیں

ڈالتا۔ ہمارے گلے میں

تو کملے کا پٹہ پڑا ہوا ہے، ہمیں دنیا سے کبھی کچھ نہیں ملے گا۔ صرف ایک ہی در سے ملنا ہے۔ پرائی کملی کو کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا۔ ہم نے بھی کلمہ پڑھا ہے۔ ساری دنیا کہتی ہے تیری دعا کو کیا ہوا؟

کفر آج باتیں کرتا ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہمیں اپنے رب سے مانگنا نہیں آتا۔ اپنے اللہ سے مانگیے! پھر دیکھیے اللہ کیسے رحمت کے دروازے کھولتے ہیں۔ ہماری ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ دنیا و آخرت کی سعادتیں عطا کرتے ہیں۔ آپ اسی کیفیت کے ساتھ مانگیے اللہ تعالیٰ آپ کو عطا کریں گے۔ اللہ یہ سب آپکی رحمت کے سہارے بیٹھے ہیں، آپ کے گھر کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھے ہیں۔ ہم اس وقت تک نہیں اٹھیں گے جب تک آج آپ کو منا نہیں لیں گے۔

تنگدستی کے جو عالم میں میں گھبراتا ہوں
ہر در غیر پر جاتے ہوئے کتراتا ہوں
ہاتھ پھیلانے میں محتاج کو غیرت کیسی
شرم آتی ہے کہ بندہ تیرا کہلاتا ہوں

اے اللہ! بندے آپ کے کہلائیں اور درِ غیر پر چلے جائیں، بس آپ ہی سے مانگیں گے۔

تم ہی سے مانگیں گے تم ہی دو گے
تمہارے در سے ہی لو لگی ہے

اپنے رب کو منا لیجیے۔ اللہ سے اللہ کو مانگ لیجیے۔ اللہ رب العزت ہمیں اپنا قرب، اپنی رضا اور اپنی لقا نصیب فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

وَآخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مکتبۃ الفقیر کی کتب ملنے کے مراکز

- معہد الفقیر الاسلامی ٹوبہ روڈ، بائی پاس جھنگ 047-7625454
- دار المطالعہ، نزد پرانی ٹینکی، حاصل پور 062-2442791
- ادارہ اسلامیات، 190 انارکلی لاہور 7353255
- مکتبہ مجددیہ، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور 042-7231492
- مکتبہ سید احمد شہید 10 الکریم مارکیٹ اردو بارزار لاہور 042-7228272
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور 041-7224228
- مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان 061-544965
- مکتبہ دار الاخلاص قصہ خوانی بازار پشاور 091-2567539
- مکتبہ الشیخ 445/3 بہادر آباد کراچی 0214935493
- دار الاشاعت، اردو بازار، کراچی 021-2213768
- مکتبہ علمیہ، دوکان نمبر 2 اسلامی کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن کراچی 021-4918946
- مکتبہ حضرت مولانا پیر ذوالفقار احمد مدظلہ العالی مین بازار، سرائے نورنگ PP 09261-350364
- حضرت مولانا قاسم منصور صاحب ٹیپو مارکیٹ، مسجد اسامہ بن زید، اسلام آباد 051-2288261
- جامعۃ الصالحات، محبوب سٹریٹ، ڈھوک مستقیم روڈ، پیرودھائی موڑ، پشاور روڈ، راولپنڈی 03009834893 ، 051-5462347

مکتبۃ الفقیر 223 سنت پورہ فیصل آباد